. . . . قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی بروقت عمل کرتے اور دلائل منع بدعات پر بھی عمل کرتے ہیں اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ فرح ماموربہ کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال ۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملۃ کردیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ہوگی جیسا محض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہوگیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جلدی رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں ۔ جیسا کہ اہل تجدید بالجیم المعجمۃ کا طریق متعارف ہوگیا اور اعتدال امت میں ہے پس نہ ہم محدد ہیں نہ مجدد بلکہ قدیم ہیں والحمد للہ علیٰ ذالک ۔

دوسرا استدلال اور اس کا جواب

دوسرا استدلال موجدین کا۔ اس حدیث سے ہوسکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں آکر ایک باندی کو آزاد کردیا اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہوگئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز ہے اور موجب برکت ہے ۔ جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے ۔

تیسرے استدلال کا جواب

تیسرا استدلال اس آیت سے ہوسکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔ وَاِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الی قولہ) رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۔ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں ۔ عیسیٰ کی اس دعا تک کہ اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جائے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہوچکا ہے کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نقل فرماکر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں، اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظمیٰ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا ۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو، جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ط

لہ خوشی

میں سجدہ تحیت منقول ہے اور سجدہ تحیت اور سجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہوچکا لیکن یہاں پر اس پر انکار منقول نہیں ۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں ۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت و احادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں ۔ یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جب کہ آیت کے معنیٰ یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنادیں، اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا ۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنیٰ بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا پس معنیٰ یہ ہیں کہ تکون المائدۃ سرورا لنا، یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہوجاوے ۔ عید کے معنیٰ متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ہی مراد ہو جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م، ت، ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک جہاں گویا شیخ سعدیؒ کے شعر ؎

؎ تمتع زہر گوشہ یافتم " سے یہی متعہ نکلتا ہے ۔ اور آیت " رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ اے رب ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ۔ ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع، ی، د، آوے اس سے عید میلاد النبی کا جواز ثابت ہوتا ہے ۔

چوتھا استدلال اور اس کا جواب

چوتھا استدلال اس قصہ سے ہوسکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنالیتے . . . ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے دن ہی نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نزلت فی یوم جمعة وعرفة یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت عمر و بن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک نہ سوجھتا ۔ لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہوسکتی ہے ۔ اس کے دو جواب ہیں ۔ ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا ۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو ۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ حجاج کے مشابہت سے جمع ہونے پر

انکار فرمایا ہے۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں۔ نیز حضرت ابن عباسؓ نے تحصیب کو لیس بشیئ کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا۔ تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا۔ اور حضرت عمرؓ کا انکار اجماع علی شجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہوگیا۔ گو ہر ہر مقام پر انکار منقول نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا۔ اس کا خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنا ناجائز نہیں یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعیید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے۔ مگر خدائے تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اور اس کا جواب

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا۔ کسی نے پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا۔ ذالک الیوم الذی ولدت فیہ۔ یعنی میں اس دن میں پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادت عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادت قربت ہے لہذا یہ جائز ہے۔ اس کے بھی دو جواب ہیں۔ اول تو یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے۔ بس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے۔ اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہیں تو تم نے حکمت حکمت کو اصل علت ٹھہرایا۔ حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو۔ اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں اور نیز مثل یوم الاثنین کے یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت، فتح مکہ، معراج وغیرہا، آپنے ان کی علت سے کیوں کوئی عبادت نہ

فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعیید چاہیئے، اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی۔ پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہیئے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادت دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں۔ یوم الاثنین میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ ہر ہر پیر کو عید کیا کریں۔ غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین کا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے

عقلی دلائل کا جواب

اب ہم اس باب میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف۔ اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں جاننا چاہیئے کہ جس قدر عبادت شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں۔ ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں۔ اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو سبب کے مکرر ہونے سے مسبب بھی مکرر پایا جاویگا، مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود شہر سبب ہے۔ جب شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے۔ چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے۔ یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اسی لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار[1] اور توحد[2] سے مسبب متکرر[2] اور متوحد[3] ہو تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو، جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب ارارۃ قوت تھی اب وہ ارارۃ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے

---

[1] ایک ہونا [2] مکرر ہونا [3] ایک ہونا۔

ہوئے اکڑ کر طواف کرو تاکہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہدہ ہو۔ اب وہ سبب تو ہے نہیں لیکن مامور یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو عمل خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گذر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہوگئی، کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے۔ وہ اس خاص یوم الولادت کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے۔ پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولدت فیہ سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہوسکتا ہے کہ یوم الولادت تو گذر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اب ہم ترعًا ان حضرات کو بھی ایک دلیل عقلی لکھ کر اور اس کا جواب دیکر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح علیہ السلام کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی درجہ میں صحیح ہو، ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئی نہ ہو، ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شعائر اسلام کے لئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدین اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہیئے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو۔ اسی طرح عاشورہ کے دن تعزیہ داری بھی کیا کرو، تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو۔ چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی دیوالی ہوتی ہے ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دیوالی کیا کرو۔

ایک قصہ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکائے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا۔ بعض صحابہ رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ" اجعل لنا ذات انواط " یعنی یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی آپ ایک ذات الانواط مقرر فرما دیجئے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرما دیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار اور کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں۔ دیکھئے بظاہر اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبیہ بھی کچھ نہیں لیکن صورۃً ان

کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ علیہ السلام نے موسیٰؑ سے کہا تھا۔ اِجْعَلْ لَنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ۔ پس جب اس مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جائے یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس باب میں گفتگو تھی جو اختصار کیساتھ بیان کی گئی ہے غرض عقل سے نقل سے ہر طرح بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید مخترعؔ ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مسرت دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اسی آیت پر عمل کریں

(السرور صہ ۲۹)

۲۳- پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے

حضرات اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑے عالی شان پختہ بنائے جاتے ہیں یہاں بھی منشاء وہی عظمت ہے مگر اس کا ظہور بری طرح ہوا کیونکہ شرعًا تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزارات پختہ بنائے جائیں وہ تو کچی قبریں بھی ویسے ہی معظم و محترم ہیں جیسے پکی قبریں بلکہ کچی قبروں پر بوجہ موافقت سنت کہ انوار زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بختیار کاکیؒ کی کچی قبر پر ایسی ہیبت برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں اور اگر کسی کے آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کچی قبر پر جو انوار ہیں وہ پختہ قبر پر کہاں۔ اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں اور پختہ مزارات تمام تر رؤساء اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیزیں انوار کہاں؟ اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پرواہ نہیں ہوئی۔ پھر یہ چوچلے قبروں کے پختہ و آراستہ بنانے کے ان میں کہاں سے آجاتے ہیں۔ یقینًا یہ بزرگوں کا کام نہیں بلکہ سلاطین و امراء کے چوچلے ہیں انہیں کو ایسی باتیں سوجھا کرتی ہیں جو سلاطین و رؤساء دین

ؔ من گھڑت

سے نا آشنا ہیں ان کو تو دوسری طرح کے فسق و فجور کے چوچلے سوجھتے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دینداروں سے کچھ محبت ہے ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے چوچلے سوجھتے ہیں۔ جیسے ایک رئیس حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے ایک نہایت قیمتی خوشنما بھڑکدار پوستین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کریں۔ مولانا نے اسے ایک نواب صاحب کو دیدیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے آپ کے کپڑوں پر یہ اچھی لگے گی کیونکہ آپ کا اور لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا۔ اور میں لٹھے، گاڑھے دھوتر کے اوپر اس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا پھر اس کی حفاظت کپڑے سے کون کریگا مجھے اتنی فرصت نہیں فضول اس کو رکھ رکھ کر ضائع کروں۔ غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھگڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لئے ان خرافات کو کیسے پسند کریں گے یہ پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ پھر یہ قبر کے وضع کے بھی خلاف ہے کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے وہ ان پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

زیارت قبور کا منشاء

زیارت قبور سے غرض ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے تو یہ بات کچی اور شکستہ قبروں ہی سے حاصل ہوسکتی ہے شکستہ قبر سے دل پر اثر ہوتا اور موت یاد آتی ہے۔ ان شاہی قبروں سے موت تھوڑا ہی یاد آتی ہے نہ زوال و فنائے دنیا پیش نظر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے تو میں کہوں گا یہ محبت تعزیوں والی جیسی ہے کہ ان کو بدون تعزیہ بنائے اور مرثیہ گائے شہداء پر رونا نہیں آتا سچی محبت و عظمت کو اس ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گرتا تھا بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔

صحابہ کا عمل

مگر باں ہمہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پختہ نہیں بنائی بلکہ کچی ہی رکھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے تو پس محبت و عظمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر جان و مال سے فدا تھے پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے تو اس کے جواب میں اول تو میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے تمہارے باقی رکھنے سے وہ باقی

رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے۔ دیکھو بہت سی پختہ قبر والے مردے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تو کیا پختہ قبر ہی بنانا بقاء کا ذریعہ ہے ہرگز نہیں باقی اصل رکھنے والی چیز اہل اللہ کی ولایت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں پس وہ آپکی ابقاء کے محتاج نہیں۔ عارف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

اور مولانا نیاز فرماتے ہیں ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

پکی قبریں

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر کچی رکھو اور ہر سال اس کی لیپ پوت کرتے رہو۔ مٹی ڈلواتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ یہ اہل دنیا پکی قبر اس بزرگ کی بنواتے ہیں کہ جس کو اپنے زعم میں پورا متبع سنت نہیں سمجھتے اور جس کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس کی قبر کچی ہی بناتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کچی ہے اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں ان کے مجاوروں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا حضرت متبع شریعت بہت تھے اس لئے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا۔ گویا نعوذ باللہ دوسرے اولیاء اللہ متبع شریعت نہ تھے تو اس فعل سے اپنے بزرگوں پر ایک سخت الزام لگانا ہے کہ یہ متبع شریعت نہ تھے۔ سو اس وجہ سے بھی یہ فعل قابل ترک ہے۔

پختہ قبر ممنوع ہے

قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت سمجھو وہ یہ کہ پکی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا کیوں کہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں پختہ ہی ہوتیں تو آدمیوں کو تو رہنے کے لئے جگہ بھی نہ ملتی نہ زراعت کے لئے زمین ملتی کیونکہ مردے اس قدر گذر چکے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کا مُردوں سے خالی نہیں۔ بتلائیے اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لئے کہاں ٹھکانا ہوتا۔ پس قبروں کے اوپر دو منزلہ سہ منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہوجاتا۔ اور کچی قبریں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اس پر اتنی مدت کے بعد زراعت بھی کر سکتے ہیں جس میں یہ یقین بھی ہوجاتے کہ مردہ کا جسم خاک خوردہ ہوگیا ہوگا۔ اور یہ بات کہ ہر جگہ قبر دے ہیں زندوں کی مردم شماری پر نظر کر کے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب ایک زمانے میں اتنے آدمی جمع ہیں تو اس چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے اور ہر شخص کی قبر کے لئے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے تو زمین میں اتنی جگہ کہاں تھی اور اسی حساب پر نظر کر کے اہل سائنس

یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہنے کی جگہ نہ ملتی۔ غرض قبروں کے پختہ ہونے سے یہ تنگی ہوتی اور اب تو انہی کے دفن ہونے کی جگہ میں سب بس رہے ہیں ان ہی کے مدفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں۔ برتن بنا رہے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے گھروں کے گھڑے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں تو قبر کا پختہ بنانا ان مفاسد پر مشتمل ہے علاوہ اس کے موت تو مٹانے ہی کے واسطے ہے اس کے بعد بقا کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

قبروں سے فیض کا سوال

اس پر اگر کوئی کہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے اس لئے قبروں کی بقا کی ضرورت ہے تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا۔ مگر اول تو وہ فیض معتدبہ نہیں کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے یا سلوک طے ہو سکے بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت کو اس سے کسی قدر قوت ہو جاتی ہے۔ غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادت ہو جاتی ہے مگر وہ بھی دیرپا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ جہاں تنور سے ہٹے اور ہوا لگی اور وہ سب گرمی جاتی رہی اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت و حرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پیوستہ ہو جاتی ہے پس صاحب نسبت کو اول تو قبر سے فیض لینے کی ضرورت نہیں۔ زندہ شیخ اس کے لئے قبروں سے زیادہ نافع ہے اور ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لئے قبر کا پختہ ہونا ضروری نہیں وہ تو آثار سے معلوم کرے گا کہ یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے پس یہ وجہ بھی کالعدم ہو گئی۔

(الفاظ القرآن صـ۵۶)

۲۴۔ ربیع الاول کی مخصوص تاریخ میں میلاد کی ممانعت

ربیع الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے،

کیونکہ یہ مہینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و تشریف آوری کا ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تقاضہ کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی اور ایک خاص تحریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہوتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ منکرات منضم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوتی ورنہ یہ مسئلہ فی نفسہا اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع مضرت جلب نفع . . . سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل ہے اس لئے اس کی تبلیغ وجوب کے درجے میں نہیں ہے، صرف مستحب او راحب المستحبات ہے۔ اور منکرات سے بچنا واجب ہے تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اسی وقت مستحب ہو سکتا ہے جبکہ منکرات سے خالی ہو۔

صوفیاء اور علماء کے ذوق کا فرق

اب اس میں صوفیہ کی اور علماء کی رائے مختلف ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے اور منکرات کی اصلاح کی جائے۔ اور علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود بھی اس کو ترک نہ کیا جائے۔ اسلئے شیوع منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے۔ اور اس بارہ میں رائے علماء کی مانی جاوے گی کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں۔ ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں۔ یعنی جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم سے مقدم ہوتی ہے۔

صوفیاء اور علماء کی رائے کا فرق ایک مثال سے

دونوں کی حالت کا فرق ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً موسم وبا میں اطباء کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کل امرود کھانا زیادہ مضر ہے۔ اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امرود کھانا نہیں چھوڑا بلکہ قلیل مقدار میں مصلحات کے ساتھ کھاتا رہا۔ اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امرود کھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصلحات کے ساتھ کھاؤنگا تو مجھے کھاتا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور وہ ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی میں رعایت کرتا ہوں بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اسلئے وہ بالکل ہی امرود کھانا چھوڑ دیتا ہے دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے۔ بلکہ ٹوکرے کے ٹوکرے پھنکوا دیتا ہے اور دبوا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امرود سے رغبت نہیں۔ اور جو طبیب امرود کھا رہے ہیں

ان کو امرود سے بہت رغبت ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ رغبت تو اس کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے بتلایئے ان دونوں میں سے کونسا طبیب لائق اتباع ہے۔ یقیناً یہ دوسرا طبیب زیادہ قابل اقتدار ہے۔ کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے۔ بس یہی حال علماء و صوفیہ کا ہے۔ صوفیہ اپنے غلبۂ شوق کا ضبط نہیں کرتے بلکہ مستحب کو برابر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء بشرطیکہ خشک نہ ہوں، انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کرلیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام بدون ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے۔

صاحبو! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر گدگدی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے۔ مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ (النور النور ص۵)

حبِّ رسول کا درجہ

اسپر لوگ ہم کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ ارے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحب رسول ﷺ تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے۔ پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے۔ بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منظم کر رکھی ہیں مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہوسکتی۔ اور یہ ذکر خاص ایام میں واجب نہیں۔ اسلئے وہ منکرات کی اصلاح کے لئے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں چنانچہ منجملہ ان منکرات کے ایک قیام بھی ہے جس میں عوام کے اعتقادات حدودِ شرع سے متجاوز ہیں۔ اس میں بھی بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسول کی تعظیم کے لئے ہے۔ اور یہ مولوی حضور ﷺ کی تعظیم سے منع کرتے ہیں۔ اس کا جواب ایک مولوی صاحب نے خوب دیا کہ ہم ذکر رسول ﷺ کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی بے تعظیمی سے روکتے ہیں کیونکہ تم لوگ ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے، پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کرو اور سامعین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں۔ تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے اور مزا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات مولویوں ہی پر کئے جاتے ہیں صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی زیادہ وحشت ناک حکم دے ہیں۔

واقعہ خواجہ باقی باللہ

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے جہر کے ساتھ لفظ اللہ نکل گیا۔ چونکہ وہ نقشبندی تھے جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے یہاں تک کہ ذکر بھی خفی بتلاتے ہیں جہری نہیں بتلاتے۔ اسلئے

آپ نے فرمایا کہ نکالدو اس کو۔ ظاہر میں یہ حکم بہت وحشتناک تھا کہ اللہ کے کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں۔ مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا بلکہ عدم ضبط پر نکالا۔ اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرائن سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا۔ اور اگر واقعی حد ضبط سے نکل جاتا تو پھر ملامت نہ فرماتے۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

دمادم شراب الم در کشند — وگر تلخ بینند دم در کشند
بہ تسلیم سر در گریباں برند — چو طاقت نماند گریباں درند

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں، جس میں احکام شریعت کی مخالفت کی جاتی اور شریعت میں ایک جدت تراشی جاتی ہے لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں۔ ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مگر مولویوں کو شریعت کی حفاظت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہیں چاہیئے کوئی کچھ کہے ان کی بلا سے۔ ایک غازیپوری مولوی اٹاوہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے تقویٰ اور تقدس کی تمام دنیا معتقد ہے صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہوجائے۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے آقا بن جائیں لیکن مکھی بال تو ہم قصداً نہیں کھا سکتے۔ اب چاہے دنیا معتقد ہو یا بے اعتقاد ہو۔ (ایضا ص۵۲)

۲۵- نماز پنجگانہ یا فجر و عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے۔

ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں حالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کہا تھا بلکہ خاص لوگوں کو بتلایا تھا مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنالیا اور التزام کرلیا۔ اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا۔ اب ان پر آوازے کسے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہوگیا۔ ہائے علماء کی بھی مصیبت

ہے۔ ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں۔ مگر محققین صوفیہ ان سے خوش ہیں وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محقق صوفی ہیں فرماتے ہیں کہ شرع صوفیہ دقیق ہے جو عوام کی فہم سے بالا ہے اس لئے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں۔

علماء کی مثال

نظام شریعت بلکہ عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے۔ ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو ہم تو سب لوگوں کو کافر ہی بنا دیتے۔ کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں نہ معلوم وہ کیا سے کیا سمجھتے اور ایمان کو برباد کر دیتے۔ مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مخلوق کا ایمان سنبھال رکھا ہے تو اے وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آوازے کسا کرتے ہیں تو اس کا احسان مان کہ تو انہی کی بدولت چین سے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا اور گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا ہے۔ منتظم پولیس کی قدر جب ہی ہوتی ہے جبکہ رات کو راحت سے پڑ کر سوتے ہو، پس یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال وقال رکھا رہ جاتا۔ کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔ اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر ملا بننا فرض ہو جائے گا۔ پس تیری گھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ منتظم جماعت دنیا میں موجود ہے تم تو رات کو پڑ کر آرام کرتے ہو۔ اور آنکھ کھل گئی تو نماز اور ذکر میں مشغول ہو جاتے ہو۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا حال

اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ رات کو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہمانوں کے پیر دبایا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا کون ہے تو فرما دیتے کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر، یہ سن کر مہمان خاموش ہو جاتے۔ بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب پیر دبانے آیا کرتے ہیں۔

شیخ الہندؒ کا واقعہ

یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے استاذ مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ، کی ایک حکایت اس سے بڑھ کر سنی ہے مجھے تو یہ حکایت سنکر پسینہ آگیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مٹا دیا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک مہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا، گرمی کی دوپہر میں جب مہمان سو رہے تو مولانا دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبانا شروع کئے، راوی کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا میں گھبرا کر پہونچا اور عرض کیا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں، فرمایا یہ بے چارہ تھکا ماندہ ہے۔

اس کی تھکن اتار رہا ہوں۔ میں نے کہا حضرت پھر میں دباؤں گا آپ للہ ہٹ جائیں فرمایا نہیں تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور مہمان بھی ہو۔ بس تم پڑے رہو۔ غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پیر دبائے اور وہ بے ہوش پڑا سوتا رہا۔ کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھلے گی جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے یہ تو بیداری میں بھی سوتے ہی ... ہیں۔ اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ منتہی ہو کر ایسا کام کیا۔ بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے ہم نے تو کسی کو بھی نہیں سنا۔ پھر وہ کس منہ سے علماء پر آوازے کستے ہیں۔ (الرغبۃ المرغوبہ صفحہ ۳۰)

۲۶ - سجادہ نشینی محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔

آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے، آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا۔ اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بیٹھا کر خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور ایک کہیں، ایک کہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جابجا ہوں۔ یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا محل نہیں۔

حکیم الامۃ کا ایک واقعہ

مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے لئے ...... کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت ..... میرا حق نہ ہوگی دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہ ہوگا۔ نہ اس میں وراثت چلے گی۔ جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو۔ چاہے وہ جولاہا یا قصائی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈاک میں ایک کارڈ پر اتنا لکھ کر میرے نام ڈالدے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جولاہا بھی منع کر دے گا تو میں اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔

گدی نشینی

غرض آجکل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہوگئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں ۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ اسی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے ۔ ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے ۔ میں بھاگلپور گیا تو ایک سجادہ نشین کے بابت سنا کردہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے ۔ میں نے کہا کیا وہ مستورات ہیں ، مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لئے پھرے ، ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانگی نہیں ، البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے ۔ پھر اس التزام کے بعد اگر سجادہ نشین صاحب کی کبھی کسی عدالت میں طلبی ہوگئی تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے ۔ کیونکہ آجکل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں ۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے ۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا ۔ کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا ۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی کو حَکَم بنا کر فیصلہ کرالو ، پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائے گا ۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہوگئے ۔ اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہوگئے ۔ بالآخر میرے نام سمن آیا اور مجھے شہادت کے لئے عدالت میں بلایا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے ۔ میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا ۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا ۔ اور میری . . . . . شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہوگیا ۔ اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا کیونکہ ان کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا ۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں ، اس میں عزت ہے اور خود جانے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑیگا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کریگا پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا ۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اس کو اپنے یہاں بلاؤں جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب تکوین کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیئے ۔ اس لئے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں ۔ مگر آج کل رسم کا غلبہ ہے لوگ

اس کو ذلت سمجھتے ہیں ۔

ایک حکایت

اصل مضمون گدی نشینی اور قضا میں میراث ملنے کے متعلق تھا ۔ ایک خرابی یہ ہے کہ ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بنئے کے مقروض ہوگئے اس نے نالش کر دی جہاں قاضی صاحب کی زمین قرق ہوئی ۔ وہاں خطابت کی آمدنی بھی قرق ہوگئی ، کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی ۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل کر عیدگاہ میں پہنچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوتی باندھے آرہے ہیں ۔ اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آگئے میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ کیسا امام ہے ۔ کیا بنیا عید کی نماز پڑھائے گا ۔ اب وہ بنیا آکر سلام کرکے ممبر پر کھڑا ہوگیا اور کہا ، ماجو ! اجازت ہے ، لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا ، جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جوڑا ۔ اور بہی میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی ہوئی ۔ پوٹلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاجو ! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کرکے اپنے گھر کو چل دیا اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ ۔ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہوگی تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بنئے کے مقروض ہیں عیدین کی آمدنی بھی اس نے قرق کرالی ہے اس لئے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی ۔ یہ نتیجہ ہے امامت اور قضاء کی موروثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی قرق کرانے لگے ۔ ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑووں میں صرف ہوتی ہے ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق ۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا ۔ اسی طرح ہزاروں اوقاف برباد ہوگئے ۔

(اصلاح ذات البین صـ۴۹)

۲۷ - عیدگاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت

عیدگاہ میں باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع سے ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں۔ ارشاد ہے جنبوا مساجدکم صبیانکم، کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بال بچوں کو علیحدہ رکھو، لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عیدگاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجدکم میں دو۲ احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہے تب تو عیدگاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہری ہے۔ اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عیدگاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ ملوّث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑیگا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عیدگاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہٰذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عیدگاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ولیعتزلن الحیض المصلی پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ (وعظ اکمال الصوم والعید ص۶)

۲۸ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ جس سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جائز نہیں،

ایکمرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھو دی تھی انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کر دی انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اٹھا دیا وہ صحابی آپ کے پہلوئے مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور

عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے وفات نامہ میں حضرت عکاسہ کی حکایت گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی ہے۔

غلط کتابیں

ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے سائین نامہ، معجزہ آل نبی، وفات نامہ، نور نامہ، معراج نامہ، علی محمد، البتہ معجزہ ہرنی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوا دیا ہے سب لغو ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ایک وہ مسدس ہے جس کا ٹیپ ٹاپ کا مصرعہ یہ ہے۔

ع "مری یار کیوں دیر اتنی کری"

یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہیئے اس ظالم نے ابتداء سے انتہا تک خدائے تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت کے مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر حسد کے بعد یہ شکایت ہے کہ مجھے کیوں نہیں ملا یہ کتابیں ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلا تامل آگ میں رکھ دینا چاہیئے معجزہ آلِ نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا۔ بالکل ہی غلط ہے اور لغو ہے، اسی طرح حضرت عکاسہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ (وعظ مضار المعصیت ص۶)

انبیاء کی شان میں گستاخی

بعض مصنفین اور واعظین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جزئی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں صریح گستاخی ہو جاتی ہے۔

۱۔ ارشاد فرمایا کہ یہ جو بعض مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت اور انبیاء پر ثابت کرنے کے لئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک فضیلت جزئی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کریں خواہ اس کی نسبت کوئی ثبوت نصوص سے بہم پہنچ سکے یا نہ خواہ دلائل نصوص اس اثبات مدعا کے معارض ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تنقیص ہی ہو جاوے، پر فضیلت جزئی بھی ثابت ہو جائے یہ کوشش پسندیدہ نہیں، کیونکہ فضیلت کلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے اور کسی جزئی فضیلت کا ثابت ہونا قادح فضیلت نہیں جیسا کہ کسی صحیح البصر کی آنکھ کا کامل ہونا دلیل اس کی نہیں کہ وہ یعقوب علیہ السلام سے افضل ہو۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے حسن ظاہری کی فضیلت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وھو

قد اعطی شطر . . . (الحدیث) سے ثابت ہے اب اس میں فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرنا ایک معارضہ ہے خود ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایہام تنقیص ہے جمال یوسف علیہ السلام کا جو بے ادبی سے خالی نہیں ۔

حسن کی دو قسمیں

ہاں یوں کہا جاوے تو سب پہلوؤں کی رعایت ہے کہ حسن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو دفعۃً ناظر کو متحیر کر دے مگر اس کے دقائق تامل کرنے سے متناہی ہو جائیں ۔ اور اس کا لقب حسن صباحت مناسب ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر مصداق ہو اس شعر کا ؎

یزیدک وجہہ حسنا   اذا ما زدتہ نظرا ۔

اور اس کا لقب حسن ملاحت بہتر ہے، پس قسم اول میں یوسف علیہ السلام کو افضل الخلق کہا جائے ، اور قسم ثانی میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ (مقالات حکمت ص۱۱ ، دعوات عبدیت حصہ اول)

نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو

(ب) آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی ہے "سیرۃ النبی" اس کا نام ہے ۔ مولوی شبلی نعمانی کی تصنیف ہے) اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دیکر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کرام کی توہین کا ۔ آپ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں، اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے ۔ ان کی تنقیص کی ہے ۔ لکھتے ہیں کہ :-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی ترحم تھا ۔ باقی اور انبیاء علیہم السلام میں سے کسی میں سیاست نہ تھی کسی میں ترحم نہ تھا کسی میں یہ صفت نہ تھی کسی میں وہ صفت نہ تھی ۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی، ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں تو ایسی مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم . . . . . کب خوش ہو سکتے ہیں ، اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے کہ دیکھو نوح علیہ السلام میں ترحم نہیں تھا ۔ ترحم کا مادہ کم تھا عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا درویشانہ زندگی تھی ۔

میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی ۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ قیمتی، خط نہایت نفیس پر رونق، ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہیں کہ نوح علیہ السلام میں ترحم نہ تھا عیسیٰ علیہ السلام

میں سیاست نہ تھی، کس قدر بے ادبی کی انبیاء علیہم السلام کی شان میں ۔

ہر خوبی کا ہر وقت ظہور لازم نہیں

اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے ۔ آپ اس کے پاس گئے اس وقت دیکھا کہ وہ خرچ بھی نہیں کر رہا تھا پس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے اس کو یہی کہا جاویگا کہ جس وقت آپ گئے اس وقت ظہور کا موقع نہ ہوگا ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا سخی ہے ، ایسے انبیاء علیہم السلام میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر وہ خدائے تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں ۔ اس کا ظہور ہوتا ہے ۔

نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نوسو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے مگر بد دعا نہیں کی اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہوگا ؟ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی ، پھر اس وقت بد دعا فرمائی جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا ۔ اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا ، معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں ، نوسو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی ۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر وہ ۔ دیکھو تو نوح علیہ السلام میں ترحم کیسا تھا کہ نوسو پچاس برس تک قوم کی تکالیف پر صبر کیا اور بد دعا نہیں کی ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تختہ مشق ہیں ، کہتے ہیں کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے ۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کلہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو ۔ مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حق ادا کیا ہے ، اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب بدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا ۔ عدم ظہور سے عدم وجود لازم نہیں آتا ۔ دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے ان کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیسے ہو سکتی ہیں ، کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا ۔ حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے ، خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادے سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں ۔ (وعظ الحیوٰۃ ص۲۱)

انداز بیان میں احتیاط

(ج) غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر معقول کا غلبہ ہے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ میرا تو ایسی باتوں سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے چنانچہ ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے تسلی دی تھی لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا جس میں اول لا تحزن فرما کر غم کو ہلکا کر دیا پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا۔ اور معیت میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شریک فرمایا کہ صیغہ جمع معنا استعمال فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا۔ کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ جس میں سب سے پہلے کلا کا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے عربی میں لفظ کلا کا ایسے ہی موقعوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کلا بھی استعمال ہوتا ہے گویا کلے پر طمانچہ مار دیا پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا یعنی لفظ معی کو ربی سے پہلے ذکر کیا۔ گویا یہ حضرت مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھلاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی نعوذ باللہ معلوم نہ تھے پھر یہ بھی وجہ فضیلت کی بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے معی بصیغہ مفرد بیان فرمایا جس میں معیت الٰہیہ کو اپنے ساتھ خاص کیا قوم کو اپنے ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا۔ مجھے اس مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا کیونکر، بس میں تو یہ کہوں گا کہ

ع "سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا است"

اول تو ان کو جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ منصوصہ کیا کچھ کم ہیں جو جزئیات غیر منصوصہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اگر ان کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہیئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون ہے، کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال و ہر موقع و محل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقع کے لئے جدا طرز ہوا کرتا ہے ؎

"ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد"

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور مانع کے لئے بمقابلہ مستدل کے احتمال کافی ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غار ثور پہنچے ہیں تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا چادر یا لنگی پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے۔ تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے۔ سارے سوراخ تو بند ہو گئے مگر ایک رہ گیا۔ اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس حالت میں جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضرت کو اذیت پہنچائیں۔ جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیئے، جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشاء بھی محض یہ تھا۔ ع

"عشق است وہزار بدگمانی"

ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دولتِ توکل سے پوری طرح مالا مال تھے، ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے "لا تحزن" فرمایا۔ پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر متوکل نہ تھے نہ ایسے جاں نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا۔ محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ قَالَ اَصْحَابُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ جس میں انّ اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید۔ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بار بار دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح

مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہوگیا۔ صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کلّا۔ گویا چپت لگادیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا۔ اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلّا میں ہے پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے۔

اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تقدیم ماحقہٗ التاخیر یفید الحصر اور اسی وجہ سے معی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو، اب بتلائیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہتے جو موسیٰ علیہ السلام نے ادا۔۔۔ فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لاتحزن ان اللہ معنا ہی فرماتے ہیں جو لوگ بلاغت سے کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی طرز اختیار فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا ہے تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی احتمال نکال کر باطل کر سکتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہیئے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہیئے۔

(وعظ الرفع والوعظ ص۴۶)

۲۹ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے

بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں، چنانچہ شعراء اشعار نعتیہ میں اس مضمون کو باندھتے ہیں سو عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا۔ اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ بعض بیباکوں نے اس اضطراب کو بھی نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے لئے مان لیا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسفؑ   محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دنیا میں بھیجدیا اور چونکہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدون معشوق کے قرار نہیں ہوتا۔ اسلئے تسلّی کے واسطے سایہ ان کا وہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہوگئی تھی۔ یہ نعت نہیں یہ حد درجہ کی بے ادبی ہے باری عز اسمہٗ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشعار سننا اور پڑھنا گناہ ہیں، احتراز ضروری ہے بعض دینداروں کو بھی خبط ہوتا ہے کہ اشعار نعتیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہے۔ الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے۔ اس لئے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لئے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور تاثر سے پاک ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اگر کوئی عشق کو معنیٰ مجازی میں لینے لگے تو حق تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے۔ البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو۔ اس کو معذور سمجھیں گے بدون غلبۂ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مقربان الٰہی کو محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

(وعظ ترجیح المفسدہ ص۱۸، دعوات عبدیت حصہ ششم)

۳۰ - مُردہ کی رُوح دنیا میں واپس نہیں آتی۔

کسی مُردہ کی روح کا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کسی پر آنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گو بعض آثار سے ایسا شبہ ہوجاتا ہے کیونکہ قرآن میں ہے، کافر بعد موت کے کہتا ہے۔ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آنیکی تمنا ہوتی ہے لیکن برزخ یعنی حائل دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر متنعم[1] میں مردہ ہے تو اسے یہاں آکر لپٹے پھرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر معذب[2] ہے تو فرشتگان عذاب کیونکر چھوڑ سکتے ہیں کہ وہ دوسرے کو لپٹتا پھرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہے جس کا لوگوں پر اثر

[1] عیش و راحت [2] عذاب میں مبتلا۔

ہوتا ہے اور جس شخص پر مسلّط تھا اسی کا نام لے دیتا ہو اور ممکن ہے کہ دوسرا کوئی شیطان ہو، اور شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ یجری من الانسان مجری الدم او کما قال غرض کہ جنون اور شیطان کا اثر کہ وہ بھی شریر جن میں ہوتا ہے اور مُردہ روحوں کا اثر جیسا کہ مشہور ہے صحیح نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لئے ارواح کا یہاں آنا ضروری نہیں دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے، جواب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے لیکن جب تک اس کی دلیل قوی نہ ہو اس احتمال کو قبول نہیں کیا جا سکتا، محض امکان کافی نہیں۔ (مجادلات معدلت ص۱۵ دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

(غیر مُقلّدین کے اعتراضات کا حل)

۳۱ - اور اس کا جواب

کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہراً وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے، خصوص میں جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ اِن یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا[1]۔
جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہونچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے تو اس پر ما لیس لک بہ علم صادق نہ آوے گا بلکہ وہ ما لک بہ علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ ثبتہ حجت قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع ما لیس لک بہ علم کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہوگا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنیٰ مصطلح فقہی نہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہے، باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی، چنانچہ منکرین بعث کے قول میں ان نظن الا ظناً آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا۔ چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے علم میں صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی، پس معنیٰ آیت ذم ظن کے یہ ہیں۔ ان یتبعون الا ما خلف الدلیل القطعی وکل ما خلف الدلیل القطعی لا یغنی من الحق شیئاً بل ہو باطل قطعاً۔ پس اس آیت سے بھی شبہ

[1] وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر گمان کی اور کوئی شک نہیں کہ گمان حق سے بے نیاز نہیں کرتا ہے۔

کی گنجائش نہ رہی۔ (تطہیر الاعضاء ص۱)

۳۲ - انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب،

غیر مقلد کہا کرتے ہیں کہ کیا حنفیوں کے پاس انقطاع اجتہاد کی وحی آگئی ہے حالانکہ قدرتی قاعدہ ہے کہ ہر شئی عموماً اپنی ضرورت کے وقت ہی ہوا کرتی ہے جس فصل میں عموماً بارش کی حاجت ہوتی ہے اسی فصل میں بارش ہونے کا قاعدہ ہے اسی طرح ہوائیں حاجت کے وقت چلا کرتی ہے جہاں سردی زیادہ پڑتی ہے وہاں کے جانوروں کے اون بہت بڑے ہوتے ہیں اس کے بیشمار نظائر ہیں اسی طرح جب تک تدوین حدیث کی ضرورت تھی بڑے بڑے قوی حافظہ کے لوگ پیدا ہوئے تھے اب ویسے نہیں ہوتے اور تو اور اہل حدیث میں سے بھی کسی کو بخاری اور مسلم تک خود امام بخاریؒ اور مسلمؒ کی طرح مع سند حفظ نہیں اسی طرح جب تک تدوین دین کی ضرورت تھی قوت اجتہادیہ لوگوں میں بخوبی موجود تھی، اب چونکہ دین مدوّن ہو چکا ہے، اور اصول وقواعد ممہد ہو چکے ہیں اب اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں رہی، ہاں جس قدر اب بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے اتنی قوت اجتہادیہ بھی باقی ہے (یعنی اصول مجتہدین کے تحت میں جزئیات جدیدہ کا استخراج کر لینا۔
(مجادلات معدلت ص۲۳ حصہ ہفتم)

۳۳ - آج کل دین کی حفاظت کے لئے تقلید شخصی نہایت ضروری ہے

گو فی نفسہ یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہؒ سے پوچھ لیا کبھی اوزاعیؒ سے اور اسی طرح سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے گو فی نفسہ تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا اس کے سمجھنے کے لئے اول ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ کہ حالت غالب کا اعتبار ہوتا ہے۔ سو حالت غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدیّن غالب تھا۔ ان کو مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو

اتفاقی طور پر ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اسپر عمل کریں گے بس اگر تدین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی۔ حدیث میں ہے، ثم یفشوا الکذب کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو جتنا خیر القرون سے بُعد[1] ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ۔ ۔ ۔ ہے اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو اسپر عمل کریں گے۔

خودغرضی کا ایک واقعہ

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ۔ ۔ ۔ ہوا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا کہ ان کا نکاح جائز نہیں، ان میں جدائی کر دینی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی ہے اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے، میں نے کہا اول تو تفریق میں بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جا سکتا کہنے لگے اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا میں نے کہا خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو، حرمت کے حق میں یکساں ہے جب میرے پاس انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی پہونچے وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ بس آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا۔ حرمت ثابت ہوئی یا نہیں انہوں نے جواب لکھدیا کہ لا تحرم المصة ولا المصتان، آپ بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لاکر دیدیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اسپر عمل کر لیا جاوے گا تو کون سی خرابی ہے آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندۂ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے گھونٹ پیئے تھے اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی وجہ ان کے فتویٰ کو تو مانا جنھوں نے حلال بتایا اور ان کے فتویٰ کو نہ مانا جنھوں نے حرام سے حرام بتایا۔ حالانکہ جنھوں نے حلال تبلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہ ہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، مگر اول تو یہ شخص

---

[1] دُوری

ان کے مذہب پر تھا۔ جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو اس کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہوگیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ نیت کا اعتبار ہے سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

ایک حکایت

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرو، فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہوگیا اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچکر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہوگئی ہے۔

تقلید شخصی کی ضرورت

ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پاویں گے اختیار کریں گے مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابوحنیفہ رح کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔ سو یہاں تو یہ شخص شافعیؒ مذہب اختیار کرے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگا یا تو اب شافعیؒ کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور ابوحنیفہ رح کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے، مگر اس شخص کو ذرا پرواہ نہ ہوگی، ہر امام کی رائے کو وہ اسی میں قبول کریگا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا سو دین تو رہے گا نہیں۔ غرض پرستی رہ جاوے گی پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں، ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تدین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے اور ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں کہ ہم تقلید شخصی کو نفع

واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اگر ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط کو تلاش کرکے عمل کرے گا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جاوے گا پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء اخیار میں سے ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف، پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑجاویں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان بھی لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔ (اتباع المنیب ص ۳۴)

۳۴ - اس اعتراض کا جواب کہ مقلدین حدیث چھوڑ کر اقوال ائمہ پر عمل کرتے ہیں۔

بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیحہ غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں۔ میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسے ہی شخص کا قول ہے۔ "قال قال بسیار است: مرا قال ابوحنیفہؒ درکار است۔"

اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کیسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے۔ خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے، ان لوگوں کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اب اس تقلید کو کوئی شرک فی النبوت کہدے تو اس کی کیا خطا ہے مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دو چار جاہلوں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی النبوت سے مطعون و متہم کیا جائے خدا نہ کرے سب مقلد ایسے کیوں ہوتے۔ میرے دل میں تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وارشادات پر عمل کرتے ہیں اس تفسیر پر جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے کیونکہ وہ ہمارے نزدیک درایت وفقہ میں اعلیٰ پایہ ہیں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ امام صاحب کا فقیہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور ان کے علوم اس پر شاہد عدل ہیں۔ اب بتلائیے اس تفسیر کی بناء پر تقلید میں شرک فی النبوت کیونکر ہو گیا۔ اس لئے کہ جس کے نزدیک تقلید کا یہ درجہ ہو گا اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہو گا اور امام ابوحنیفہؒ محض واسطہ فی التفہیم ہوں گے جو شخص بلا واسطہ عمل بالحدیث کا دعویٰ

کرتا ہے وہ حدیث کا اتباع اپنی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے، اور یقیناً سلف صالحین کی فہم وعقل ورع وتقویٰ و دیانت وامانت وخشیت واحتیاط جارے اور آپ سے زیادہ بھی، تو بتلائیے عمل بالحدیث کس کا کامل ہوا۔ آپ کا جو اپنی فہم کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں یا مقلد کا جو سلف کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتا ہے اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کر لیں گے بہرحال تقلید کی جو تفسیر میں نے بیان کی ہے یہ علم عظیم ہے اس کو یاد رکھئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

رہا مدعیانِ عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جائے اور تم اس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں، جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو۔ ہمارا عمل اس حدیث پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہوتا ہے اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں پھر ہمارے اوپر کیا الزام ہے تم پر بھی تو الزام ہے۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے تمہاری مرجوح ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے۔ تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجح ہے اور امام ابوحنیفہ رہ کے ذوق میں دوسری راجح ہے۔ اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اسلم وارجح ہے۔ پھر تمہارا اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسی کو میں دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنیٰ آیا عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل ببعض الاحادیث اگر کہو عمل بکل الاحادیث مراد ہے، سو یہ تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ آثار مختلفہ واحادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہو سکتا یقیناً بعض پر عمل ہو گا اور بعض کا ترک ہو گا۔ اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنیٰ کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کدھر سے کہتے ہو۔

مسائل اجتہادیہ

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں زیادہ مسائل اجتہادیہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ یا اور کسی امام کے قول کو لیتے ہیں تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام انہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے۔ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ ہی پر

عمل کرتا اور فتویٰ دیتا ہے تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات وعقد وفسخ وشفعہ ورہن وغیرہ کے چند سوالات ہم ان سے کریں اور ان کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ صحیحہ سے دیں قیامت آجائے گی، اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے، اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب دیں گے تو یہ تقلید ہوئی یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان مسائل کا کوئی حکم نہیں یہ الیوم اکملت لکم دینکم کیخلاف ہوگا اور یہیں سے قیاس واستنباط کا جواز بھی معلوم ہوگیا کیونکہ جب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کو کامل کردیا گیا تو چاہیئے کہ کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ قیاس واستنباط کی اجازت ہو کہ ان ہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کرکے ان کا حکم معلوم کریں۔ یہاں سے ان مدعیان عمل بالاحادیث کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو قیاس اور استنباط کو مطلقاً رد کرتے ہیں اور بعض احادیث میں جو قیاس کی مذمت ہے، وہ قیاس ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو یعنی جس کی اصل نص میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا مبنیٰ محض اپنی رائے ہو اور جس قیاس کی اصل نص میں موجود ہو اس کی مذمت ہرگز نہیں، ورنہ دین کا نقص لازم آئے گا۔ (ارضاء الحق حصہ اول صـ۲۲)

۳۵ - اس شبہ کا جواب کہ توسل میں بزرگ کی بزرگی کو رحمتِ حق میں کیا دخل ہے

توسل بالصلحاء کی جو صورت ہے کہ اے اللہ فلاں بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحم فرما۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر المرء مع من احب میں آپ کا وعدۂ رحمت ہے۔ میں آپ سے اس رحمت کو مانگتا ہوں پس توسل میں یہ شخص اپنی محبت کو اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر کرکے اس محبت پر رحمت وثواب مانگتا ہے اور محبت اولیاء اللہ کا موجب رحمت وثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ چنانچہ متحابین فی اللہ کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں۔ اب یہ اشکال جاتا رہا کہ بزرگ کی بزرگی اور برکت کو رحمت میں کیا دخل ہے؟ دخل یہ ہوا کہ اس بزرگ سے محبت رکھنا حُبّ فی اللہ کی فرد ہے۔ اور حُبّ فی اللہ پر ثواب کا وعدہ ہے۔ اس تقریر کے بعد میں اما بنعمۃ ربک فحدث پر عمل

کرکے تحدث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اگر یہ تقریر سنتے تو توسل کے جواز کا ہرگز انکار نہ کرسکتے کیونکہ اس کے سب مقدمات صحیح ہیں۔ میرا حسن ظن یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کے جاہلوں کے توسل کو منع فرمایا ہے جس کی حقیقت استعانت واستغاثہ ہے۔ (اکبر الاعمال صـ۷)

۳۶ - اس شبہ کا حل کہ لا الٰہ الا اللہ کے سوا تمام اذکار بدعت ہیں -

علامہ ابن تیمیہ لا الٰہ الا اللہ کے سوا ان سب اذکار کو بھی بدعت کہتے ہیں۔ کیونکہ سنت سے ان کا ثبوت نہیں۔ اگر میں اس وقت ہوتا تو ادب کے ساتھ ان سے استفتاء کرتا کہ علماء دین اس مسئلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کے کلمات کو الگ الگ یوں ادا کرتا ہے۔ اذا السماء ن اذا السماء ن یاد کرتا ہے پھر فطرت فطرت یاد کرتا ہے، اس کے بعد دونوں ملاکر اذا السماء انفطرت کہتا ہے تو اس کو اس طرح یاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اور شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اذا السماء ن لفظ بے معنیٰ ہے۔ اسی طرح فطرت فطرت بے معنیٰ ہے تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اس کو ضرور جائز کہتے، اور وجہ یہ بتلاتے کہ یہ تلاوت نہیں ہے۔ نہ اس شخص کو اس وقت تلاوت مقصود ہے بلکہ مقصود ذہن میں جمانا ہے تو اس پر میں کہتا ہوں کہ الا اللہ اور اللہ اللہ کرنا کیوں بدعت ہے اس میں بھی تو ذکر اللہ کو ذہن میں جمانا ہے۔ اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ بنا بر تجربہ رسوخ ذکر کے لئے یہ ترتیب بے حد نافع ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، جس کو شک ہو تجربہ کرکے دیکھ لے اب اگر وہ کہیں کہ جیسا وہ قرآن یاد کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں مبتدی للتلاوت ہے۔ اسی طرح یہ شخص اس حالت میں یہ ذاکر تو نہ ہوا مبتدی للذاکر ہوا تو میں کہوں گا کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے اس لئے وہ حکماً ذاکر ہے۔ افسوس یہ ہے کسی نے ان کے سامنے یہ مقدمات ذکر نہیں کئے اسلئے وہ ان کو بدعت کہتے ہیں معذور ہیں بلکہ طرفہ یہ ہوا کہ ان کے سامنے جہلاء صوفیاء کے غلط مقدمات پیش ہوئے چنانچہ بعض نے قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون سے استدلال کیا ہے۔ اس دلیل پر علامہ ابن تیمیہ نے صوفیہ کے بہت لتے لئے ہیں۔ اور واقعی اس سے استدلال ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس میں اللہ قل کا مقولہ نہیں۔ کیونکہ قول کا مقولہ مفرد نہیں ہوتا بلکہ جملہ ہوتا ہے، بلکہ یہ تو انزل مقدر کا

فاعل ہوتا ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے، کیونکہ اوپر ارشاد ہے قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِیْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَاؤُكُمْ قُلِ اللّٰهُ ای قُلْ اَنْزَلَ اللّٰهُ تو یہ استدلال کسی جاہل نے کیا ہوگا۔ ابن تیمیہ کو خوب موقع مل گیا۔ انہوں نے خوب خبر لی مگر اناڑی طبیب غلطی کرے تو اس سے محمود خاں اور عبدالمجید خاں سے تو بدگمانی جائز نہ ہوجاوے گی ہاں محمود خاں کو برا کہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں یہ کیا کہ اناڑیوں کے ساتھ محققین کو بھی ایک لکڑی سے ہانکا جائے محققین کے دلائل سنے ہوتے تو ابن تیمیہ کو صوفیہ پر انکار کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا بھی واسطہ نہ رہے۔ محض ذات کے ذکر پر قادر ہوجائے۔

(اکبر الاعمال ص۲۷)

۲۷- حنفی کہلانے پر اعتراض کا جواب

متبوع صرف حق تعالیٰ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے اتباع کے یہ معنیٰ ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو حنفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز اور عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال و بالذات مراد لیا جائے، تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح ہوگی۔ کیونکہ ایسا اتباع تو خدائے تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنیٰ ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز۔ پس معلوم ہوگیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس نسبت کو کفر و شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنیٰ ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے۔ اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں اور نہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم حضرت ابوحنیفہ رح کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت

خدا کے کلام میں بھی دوسرے کی طرف موجود ہے ارشاد ہے۔

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ (الیٰ) قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ۔

سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، میں سبیل کی نسبت اللہ کی طرف ہے تو یہ ایسا کہ ؎

ع عباراتنا شتی و حسنک واحد ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من بہر انداز قدرت می شناسم

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح جنھوں نے دین کو سمجھا ہے ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آوے یا حدیث کے لباس میں وہ یہی شعر پڑھ دیتے ہیں بعض نے حدیث کو اور بعضوں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کردیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا مگر ہیں دونوں طب یونانی، سو اسی طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الٰہی، اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہوگیا تو کیا وہ دین الٰہی نہیں رہا۔ جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

مقصد اتباع الٰہی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی فرمایا تھا اس کو یہاں سبیل من اناب الی فرما رہے ہیں، پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اِتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنیٰ ہیں ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب ہے۔ ملت ابراہیم علیہ السلام یہ ہے عنوان کا اختلاف باقی اصل اتباع احکام الٰہیہ کا ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہیں۔

باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ سو اگر اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ جو ان کا طریقہ ہے۔ اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقے کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی تقریر سے سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الٰہیہ کا نام ہے۔ اس کے بہت سے لقب ہیں ان

میں سے ایک لقب ملّتِ ابراہیم بھی ہے چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملّت کا نام ملتِ ابراہیمؑ رکھا گیا ہے تو واقع میں ملتِ ابراہیمؑ کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملّتِ الٰہیہ کا اتباع ہے، جوکہ ایک مناسبت سے ابراہیمؑ کی طرف منسوب کردی گئی ہے۔ تو جیسے یہاں پر ملتِ الٰہیہ کو ملتِ ابراہیم کہدیا گیا ہے۔

ائمہ اربعہ کی طرف نسبت

اسی طرح اگر ایک دین کو مذہبِ شافعی یا مذہبِ ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہدیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسول کا حکم تو نہیں ہے۔ حالانکہ واقع میں وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے۔ مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلا دیا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ القیاس مظہر لا مثبت، پس اب بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء ہی کا اتباع لازم ہوا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

چونکہ شہ خورشید وما راکرد داغ | چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہوسکتا ہے تو جب صاحب وحی ہماری نظروں سے غائب ہوگئے تو سوائے اتباع علماء کے اور کیا چارہ ہے ؎

چونکہ گل رفت گلستاں شد خراب | بوئے گل راز کہ جوئیم از گلاب

یہ شعر بجمیع اجزاء تو یہاں منطبق نہیں ہوتا ہے کیونکہ گلستاں شریعت الحمدللہ ویسا ہی ہرا بھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے اس لئے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہیے جن کے اندر صاحبِ وحی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ فیوض ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہونچے ہیں۔ پس بغیر ان کے اتباع کئے چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کرلیا جاتا ہے اور گو یہ سبیل من اناب کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل الرسولؐ ہے۔ علماء چونکہ اسے ہمیں سمجھاتے ہیں اس معنیٰ کر وہ واسطہ ہیں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کرکے سبیل من اناب کہا گیا۔

(وعظ اتباع المنیب ص۲۴)

---

۳۸ - روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے سفر کرنے پر شبہ کا جواب، نیز یہ کہ زیارت حقوق محبت نبوی سے ہے

(۱) فرمایا کہ ایک بار حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور ایک متشدد غیر مقلد سے مناظرہ ہوا اور غیر مقلد مدینہ منورہ جانے سے منع کرتا تھا۔ ولاتشد الرحال الا لثلثۃ مساجد استدلال تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، کیا زیارت ابوین، طلبِ علم وغیرہ کے لئے سفر جائز نہیں، اس کا اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر کہنے لگا اگر جانا جائز بھی ہو تو کوئی فرض و واجب تو ہو ہی گا نہیں کہ خواہ مخواہ جائے۔ حضرت نے فرمایا ہاں شرعًا تو فرض نہیں لیکن طریق عشق میں تو ہے خیال کیجئے۔ سلیمان علیہ السلام بیت المقدس بنائیں اور وہ قبلہ بن جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجد بنائیں تو قبلہ قرار پائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنائیں تو کیا اتنی بھی نہ ہو کہ وہاں لوگ زیارت کو جایا کریں چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبودیت کی تھی اور شہرت ناپسند تھی۔ اس لئے آپ کی مسجد قبلہ نہیں ہوئی اس شخص نے کہا کہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو جانا جائز ہے مگر روضۂ اقدس کے قصد سے نہ جانا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا مسجد نبوی میں فضیلت آئی کہاں سے ہے۔ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے، تو مسجد کے لئے تو جانا جائز ہو اور صاحبِ مسجد جن کی وجہ سے اس میں فضیلت آئی۔ ان کی زیارت کے لئے جانا ناجائز ہو، عجیب تماشہ ہے وہ لاجواب ہوئے اور اگر کوئی کہے کہ آپ کی زیارت کہاں ہوتی ہے صرف قبر کی ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ نے دونوں کو مساوی فرمایا ہے۔ منؔ زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی[1]۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا اھدنا الصراط المستقیم پڑھتے وقت معنیٰ کا خیال کرکے پڑھا کرو اور ہدایت کی دعا مانگا کرو، وہ کہنے لگا کہ مجھے اس بارے میں دعائے ہدایت کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے فرمایا دعا کرنے میں حرج کیا ہے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اگر حق پر نہ ہوں تو خدا کی ہدایت کرے۔ اس کے بعد قریب ہی مغرب کی نماز میں وہ غیر مقلدی کی وجہ سے

---

[1] جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی۔

گرفتار کرلیا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں تو مدینہ منورہ جاؤں گا۔ اس وقت چھوٹ کر آگیا اور مدینہ منورہ روانہ ہوگیا۔ (مجادلات معدلت ص۲۴ حصہ ایضاً)

نبی کریمؐ کا حق

ب :- ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو، بالخصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضۂ اطہر ہی سے برکات حاصل کرلیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت کی برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں حدیث میں ارشاد موجود ہے من زارني بعد مماتي فكانما زارني في حياتي اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی خود قابل توجہ ہے اگر آپ سے تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارتِ قبر مسنون نہ ہوتی۔ کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے۔ افسوس کی بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کو فضیلت نہیں مانتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجائز کے قائل ہیں۔

کانپور کا ایک واقعہ

کانپور میں ایکمرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا۔ جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی من حج ولم يزرني فقد جفاني[1] ان صاحب نے اعتراض کیا کہ "لم يزرني" فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں۔ طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا نہیں نہ اس کو کوئی جواب معلوم تھا۔ وہ سادگی سے آگے پڑھنے لگا خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی کہ من زارني بعد مماتي فكانما زارني في حياتي جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا کہئیے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب من جانب اللہ ہوگیا۔ بس خاموش رہ گئے۔ بعضے لوگ زیارت قبر پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں۔ یہ عجیب لغو اشکال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے۔ عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں، مستورات کے بارے میں کیا کہو گے۔ جس طرح صحابیت کے لئے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا۔

[1] جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا۔ اس نے میرے ساتھ ظلم کیا

یعنی ایسی جگہ پہونچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہوتا تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے۔

امام مالکؒ کا جملہ اور اسکا جواب

تیسرا شبہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالکؒ کا قول ہے يكره قول الرجل زرت قبر النبي عليه السلام۔ یعنی امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی توجب زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعل زیارت کیسے مکروہ نہ ہوگا جواب یہ ہے کہ امام مالکؒ کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو، ورنہ ان کو اس قدر پھیر پھار کی کیا ضرورت تھی وہ صاف یہی نہ فرما دیتے کہ يكره زيارة القبر النبي عليه السلام یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب تو یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں غرض دنیا میں ایسے خشک مذاق بھی موجود ہیں جن کو زیارتِ قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا۔ اس کو حرام کرکے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مگر جو زیارت کرچکے ہیں ان سے پوچھو کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔ بس اب میں بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔

احمد سید رفاعیؒ کا واقعہ

سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے عرض کیا السلام عليك يا جدي جواب مسموع ہوا وعليك السلام يا ولدي اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے ؎

في حالة البعد روحي كنت ارسلها　　تقبل الارض عني وهي نائبتي

فهذه دولة الاشباح قد حضرت　　فامدد يمينك كي تحظى بها شفتي

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا۔ انہوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے۔ ایک بزرگ سے جو اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا فرمایا ہم تو کیا تھے۔ اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ (شکر النعمۃ بذکر الرحمۃ ص۴۴)

۳۹ - تراویح بیس رکعت سنت ہیں۔

آج ہی میں نے ایک خط کا جواب لکھا ہے تعجب تو یہ ہے کہ وہ حضرت پڑھے جن ہیں اگر کوئی جاہل ہو تو اسے سمجھانا سہل ہے مگر یہ پڑھے جن بہت مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آج کل کسل غالب ہے۔ اگر ان احادیث پر عمل کیا جائے جن میں آٹھ یا بارہ رکعت کی تصریح ہے تو کیا حرج ہے۔ مجھے بھی فکر ہوئی کہ اس کا جواب کیا لکھوں۔ پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! اس مولوی کا کوئی جواب سمجھا دے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے مجھے سمجھا دیا۔ میں نے یہ لکھا کہ سیدھی سی بات ہے کہ بیس رکعت کے سنت موکدہ ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اجماع کی مخالفت ناجائز ہے اور یہ اجماع علامت ہے ان احادیث کے منسوخ ہونے کی۔ اور اگر اجماع میں شبہ ہے کہ بعض علماء نے صرف آٹھ کو سنت موکدہ لکھا ہے تو جواب یہ ہے کہ اجماع اس قول سے پہلے منعقد ہے پس اس کے مقابلہ میں شاذ قول قابل اعتبار نہیں ہوگا۔ جب تاکید ثابت ہو گیا تو اس کے ترک کرنے سے موردِ عتاب ہوگا۔ انہوں نے ایک اور بات لکھی تھی کہ صاحبِ فتح القدیر کی رائے ہے کہ آٹھ رکعتیں پڑھنا چاہیئے۔ میں نے لکھا کہ جمہور کے مقابلہ میں ایک صاحبِ فتح القدیر کی رائے نہیں چل سکتی۔ خصوصاً جب کہ ان کا عمل خود ان کے خلاف ہو۔ کیونکہ صاحب فتح القدیر کی علمی تحقیق ہے مگر پڑھیں انہوں نے بھی ہمیشہ بیس ہی، لہٰذا ان کی تحقیق قابل عمل نہیں۔

ایک واقعہ

ایک شخص دہلی کے نئے مجتہدین سے آٹھ تراویح سُنکر مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تھے اور انہیں تردد تھا کہ آٹھ ہیں یا بیس۔ یہ نئے مجتہدین اپنے کو عامل بالحدیث کہتے ہیں۔ کیوں صاحب حدیث میں بھی تو بیس آئی ہیں ان پر کیوں نہ عمل کیا۔ کہ ان کے ضمن میں آٹھ پر بھی عمل ہو جاتا۔

مقصد سہولت ہے

بات کیا ہے کہ نفس کو سہولت تو آٹھ میں ہے بیس کیونکر پڑھیں۔ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے کرتے ہیں اور شاذ اور ضعیف حدیث کو بھی سہارا بنا لیتے ہیں۔ قاری عبد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان علماء کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیشک عامل بالحدیث ہیں لیکن الف لام الحدیث میں عوض میں مضاف کے ہے اور وہ مضاف الیہ نفس ہے یعنی عامل بحدیث النفس تو واقعی یہ لوگ حدیث نفس کے عامل ہیں

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے نفس کے موافق احادیث تلاش کر لیا کرتے ہیں۔

ایک مشہور حکایت

جیسے کسی کی حکایت مشہور ہے کہ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں قرآن کا کون سا حکم سب سے زیادہ پسند ہے کہا رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ تو اسی طرح انہوں نے بھی تراویح کی تمام احادیث میں سے صرف آٹھ والی حدیث پسند کی۔ حالانکہ بارہ بھی آئی ہیں۔ اور وتر کی تمام احادیث میں سے ایک رکعت والی حدیث پسند کی۔ حالانکہ تین رکعتیں بھی آئی ہیں۔ پانچ بھی آئیں ہیں، سات بھی آئیں ہیں - - - - - - - خیر وہ تو بیچارے ان کے بہکانے سے تردد میں پڑ گئے تھے۔ تو مولانا سے پوچھا۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی سنو محکمۂ مال سے اطلاع آئے کہ مالگذاری داخل کرو اور تمہیں معلوم نہ ہو کہ کتنی ہے۔ تم نے ایک نمبردار سے پوچھا کہ میرے ذمے کتنی مالگذاری ہے۔ اس نے کہا اٹھارہ روپئے۔ پھر تم نے دوسرے نمبردار سے پوچھا۔ اس نے کہا بیس روپئے۔ تو اب بتاؤ تمہیں کچہری کتنی رقم لے کر جانا چاہیئے، انہوں نے کہا بیس روپئے لے کر جانا چاہیئے۔ اگر اتنی ہی ہوئی تو کسی سے مانگنا نہ پڑے گی۔ اور اگر کم ہوئی تو رقم بچ جاوے گی۔ اور اگر میں کم لے کر گیا اور وہاں زیادہ ہوئی تو کس سے مانگتا پھروں گا۔ مولانا نے فرمایا بس خوب سمجھ لو کہ اگر وہاں بیس رکعتیں طلب کی گئیں اور ہیں تمہارے پاس آٹھ تو کہاں سے لا کر دوگے اور اگر بیس ہیں اور طلب کم کی ہیں تو بچ رہیں گی اور تمہارے کام آئیں گی۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ سمجھ میں آگیا۔ اب میں ہمیشہ بیس رکعتیں پڑھا کروں گا۔ بس بالکل تسلی ہو گئی۔ سبحان اللہ کیا طرز ہے سمجھانے کا حقیقت میں یہ لوگ حکماء امت ہوتے ہیں۔ (روح القیام صـ)

عہد عمر میں تراویح و وتر

ب :- اس وقت اس کے اثبات سے ہم کو بحث نہیں۔ عمل کے لئے ہم کو اتنا کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ یہ روایت مؤطا مالک میں گو منقطع ہے مگر عملاً متواتر ہے امت کے عمل نے اس کو متواتر کر دیا ہے بس عمل کے لئے اتنا ہی کافی ہے دیکھئے اگر کوئی پنساری کے پاس دوا لینے جائے تو اس سے نہیں پوچھتا کہ دوا کہاں سے آئی اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی دوا ہے جو میں لینا چاہتا ہوں بلکہ اگر شبہ ہوتا ہے تو ایک دو جاننے والوں کو دکھلا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی پنساری سے یہ کہے کہ میرا اطمینان تو اس وقت ہوگا جب کہ بائع کے دستخط دکھلا دو گے کہ تم نے اس سے یہ دوا خریدی ہے تو

لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پنساری بھی صاف کہہ دیگا کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں، لیتے ہو لو، نہیں لیتے ہو مت لو، اسی طرح محققین سلف طرز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغز زنی نہیں کرتے تھے، بس مسئلہ بتلا دیا، اور اگر کسی نے اس میں حجتیں نکالیں تو صاف کہہ دیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کر لو جس پر تم کو اعتماد ہو، ہمیں بحث کی فرصت نہیں۔ مولانا عبد القیوم مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرمادیا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو وہ فرما دیتے کہ بھائی میں نو مسلم نہیں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے، اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مسلمان تھے۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا۔ اور جو ان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آرہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نو مسلموں کو ہے اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے بھلا اگر عوام کو بتلا دیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کو طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی فقہاء کے بیان میں اعتماد کیوں نہیں کرتے۔

الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کو مسنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم عملاً تراویح کی بیس ۲۰ رکعتیں پڑھتے تھے۔ عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے۔ اس وقت اس سے بحث نہیں۔ اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں ان کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں، اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔

(تقلیل المنام بصورت القیام ص۱۷)

---

۴۰ - حضرت امام ابوحنیفہؒ درایت میں سب ائمہ میں بڑھے ہوئے ہیں۔

ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ رح کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہنچی ہیں۔ یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطے سے جس قدر روایات مؤطا و آثار محمد وغیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان سب کو ہی جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسندات ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ تبعاً و ضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کر دیا۔ تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی۔ سترہ ۱۷ کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے، منقصت نہیں نکلتی۔ کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے۔ اس کا تو کسی کو انکار نہیں۔ اور انکار کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں، اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مخالفین گو امام کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ وائمین نے ابوحنیفہ رح کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونے کا بلکہ تمام فقہاء کا فقہ میں عیال ابوحنیفہؒ ہونا تسلیم کیا ہے، تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ۱۷ ہی پہنچی تھیں اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ ۱۷ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کئے کہ دوسرے ائمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہوگی۔ معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے تو ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ اس پردہ میں تو وہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں۔ خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید

کے درپے کیوں ہو، مان لینا چاہیئے اچھا امام صاحب کو سترہ ہی حدیثیں کل ملی تھیں، مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ گئے۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے ائمہ ومحدثین کے برابر نہیں، مگر درایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وقرآن کو پڑھا پڑھایا سب نے، مگر گنا حنفیہ ہی نے ہے۔

عامل بالحدیث کا قصہ ایک عامل بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے۔ مجھ سے کس لئے پوچھتے ہو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپا نہیں کرتی۔ زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آمین ورفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے غرض معلوم ہوگیا کہ کسی بات کا سننا اور ہے گننا اور ہے۔

(الجلا للابتداء ص۲)

عوام کے شبہات کا حل

۴۱ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر رونا

ایک شبہ ظاہری یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کے انتقال پر روئے اور بعض اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ وقت مصیبت کے انہوں نے الحمدللہ کہا، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے مرتبے کو کوئی نہیں پا سکتا جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ حق فرزند یہ ہے کہ ایسے وقت میں اس پر روئے۔ حق خالق یہ ہے کہ امر الٰہی پر صبر کرے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع فرمایا، حق فرزند بھی اور حق خالق بھی، اور دونوں کو ادا فرمایا۔ اور بعض اولیاء اللہ مرتبہ میں کم ہیں کہ ایک حق ان سے ادا ہوا اور دوسرا نہ ہوا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت میں بعض انبیاء بعض اولیاء پر رشک کریں گے۔ ظاہراً اس پر بھی شبہ ہوتا ہے کہ افضل کو مفضول پر غبطہ کیوں ہوگا بات یہ ہے کہ غبطہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی تو کمال کے فقدان سے سو یہ تو ہوگا نہیں، اور کبھی بسبب ایک خاص قسم کی عافیت کے مثلاً کوئی بڑے عہدہ پر ہو اور پھر ذمہ داریوں کی کثرت سے یہ کہے کہ پانچ روپے والے مجھ سے اچھے کہ آرام سے تو ہیں، اس قدر حساب کا بوجھ تو نہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا رشک کرنا اسی طرح پر ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا بڑا مرتبہ ہے۔ امت کی فکر میں مشغول ہوں گے اور بعض اولیاء اللہ ایسی مشغولی سے آزاد ہوں گے پس اس غبطہ کا یہ محل ہے۔

(مجادلات معدلت ص۳۶)

۴۲ - لڑکا لڑکی کی عمر بوقت شادی برابری ہونی چاہیئے

بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ مال کے لالچ میں بوڑھوں سے نکاح کر دیتے ہیں۔ گنگوہ میں ایک لڑکی اپنی ساتھیوں سے کہا کرتی تھی کہ جب میاں گھر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نانا جان آگئے امام صاحبؒ کی روح پر ہزاروں رحمتیں ہوں کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب لڑکی بالغ ہوجائے

تو اس پر کسی کا اختیار نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے مگر اتفاق سے امام صاحب کا فتویٰ بالکل مصلحت کے موافق آکے پڑا۔ آج کل اس کو بے شرمی سمجھتے ہیں، کہ ماں باپ نکاح کرنا چاہیں اور لڑکی انکار کر دے حالانکہ استدعا بے شرمی ہے۔ انکار بے شرمی نہیں بلکہ یہ تو عین حیا ہے کہ بیاہ کے نام کو بھی پسند نہیں کرتی۔ دیکھ لو یہ عقل کی بات ہے یا نہیں۔ تو ایسے مواقع میں لڑکیوں کو ضرور انکار کر دینا چاہیئے بعض لوگ اس خرابی کے جواب میں کہ اگر لڑکی کم سن اور مرد مسن ہو۔ تو غالب یہ ہے کہ وہ بیچاری بہت جلد بیوہ ہوگی۔ یوں کہا کرتے ہیں کہ اجی یہ تو خبر نہیں کہ پہلے کون مرے گا اس لئے کیا عجب ہے کہ لڑکی پہلے مرجائے مگر ظاہر تو یہی ہے کہ پہلے بڑے میاں مریں گے اور پھر لڑکی کی مٹی خراب ہوتی ہے۔

ہم عمری کا خیال لوگ ہم عمری کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ بالخصوص بعض قوموں میں اس کے برعکس بہت ہی رواج ہے۔ یعنی لڑکا چھوٹا ہوتا ہے اور لڑکی بڑی، دلیل سے اس کے عکس کی خرابی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگی۔ بات یہ ہے کہ خود حکماء نے کہا ہے کہ اگر کچھ عورت چھوٹی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ عورت محکوم ہوتی ہے۔ مرد حاکم۔ نیز عورت کے قویٰ ضعیف ہوتے ہیں بوجہ رطوبت کے اور اسی لئے جلد بوڑھی ہوجاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ بیبی گھی سی۔ ساٹھا پاٹھا تو اگر لڑکی چھوٹی ہوئی تو وہ جب ضعیف ہونا شروع ہوگی تو چونکہ مرد کی عمر اس سے زیادہ ہے وہ بھی ضعیف ہوگا تو دونوں ساتھ ساتھ بوڑھے ہوں گے تو باوجود یکہ عقل اس کو جائز رکھتی ہے مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ تو لڑکے کی کم عمر اور لڑکی کی زیادہ عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا خلاف عقل ہے خاص کر ان دو وجہ سے کہ شوہر حاکم ہوتا ہے اور عورت مرد سے پہلے بوڑھی ہوجاتی ہے جب عورت کی عمر زیادہ ہے تو وہ شوہر سے بہت پہلے ہی بوڑھی ہوجائے گی تو اماں جان پر حکومت کرتے ہوئے کیا اچھا لگے گا تو لامحالہ اس پر دوسری کو لادیگا اور عیش تلخ ہوگا۔

عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے بعض قوموں میں تو یہ آفت ہے کہ لڑکا نابالغ ہے اور لڑکی پوری جوان، اور دونوں کا نکاح ہوجاتا ہے۔ پھر اخیر میں فضیحتے ہوتے ہیں۔ صاحبو! میرے پاس اس قسم کے سوالات بکثرت آتے ہیں کہ لڑکا تو نابالغ ہے کوئی ایسی تدبیر بھی ہے کہ نکاح ٹوٹ سکے۔ باپ کے اختیار میں جوڑنا تو ہے - - - - - - - - - - مگر توڑنا نہیں۔ کیونکہ ولی صبی کو منافع کا اختیار ہے مضار کا نہیں۔ بعض لوگ پوچھتے

ہیں کہ اگر لڑکے سے طلاق دلوا دیں تو ہوجائے گی یا نہیں تو نابالغ کی طلاق نہیں پڑتی۔ بعض دفع لڑکا تو جوان ہوجائے اور لڑکی بہت جوان، مگر وہ طلاق نہیں دیتا۔ بعض دفعہ سوال آتا ہے کہ بہو کا لڑکے کے باپ سے تعلق ہوگیا۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ خاوند پر بھی حرام ہوگئی۔ اور وہ احتیاط بھی نہیں کرتا کہ وہ ماں بھی ہوتی ہے اور بیوی بھی۔ تو شریعت اس کو کیسے پسند کرسکتی ہے، ہاں اگر دو چار برس کا تفاوت ہو تو ہوسکتا ہے۔ کانپور میں ایک دیور سے زبردستی لڑکی کا نکاح کر دیا گیا۔ عورت اس لئے مجبور ہوتی ہے کہ اگر سسرے کا کہنا نہ مانو تو روٹی نہ ملے گی۔ غرض ان سب واقعات سے یہ معلوم ہوگیا کہ عورت کا زیادہ بڑا ہونا خلاف مصلحت ہے۔ (وعظ الرعضل للجاہلیۃ ص۵۷)

۴۳۔ علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ۔

آپ صرف اتنا کریں کہ اردو کے چھوٹے چھوٹے رسائل دینیہ جو اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کسی سے پڑھ لیں۔ اور اگر پڑھنے کے لئے وقت نہ ہو یا عمر زیادہ ہوجانے کی وجہ سے یہ دشوار ہو تو کسی سے سن لیں۔ سو اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایک دو عالم ایسے رہیں کہ جن سے یہ دو کام یعنی ان سے پڑھنے سننے کے لئے جائیں اور ان دونوں کام لینے کی چار صورتیں ہوں گی۔ اوّل تو یہ کہ اگر ان سے کوئی شخص پڑھنے جائے تو پڑھائیں۔ دوم یہ کہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ بتلا سکیں۔ تیسرے ہر ہفتہ میں ایک دن ایسا نکالیں کہ لوگوں کو جمع کر کے کوئی کتاب مسئلوں کی لیکر خود اس کے مسائل پڑھا کریں لوگ ان کو سنا کریں اور مسائل میں نماز، روزہ، حج، زکواۃ، معاشرت معاملات، وغیرہ سب کے احکام داخل ہیں سنائیں، چوتھا کام ان کا یہ ہوا کہ ہر ہفتہ یا پندرہویں دن ترہیب و ترغیب کا وعظ کہا کریں اور وعظ کی مجلس کو بیان مسائل کی مجلس سے علیحدہ کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ یہ تجربہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ وعظ میں مسائل فقہیہ کا زیادہ بیان نہیں ہوسکتا اکثر یاد میں بھی خلط ہوجاتا ہے۔ اور بالخصوص اس لئے بھی کہ وعظ میں اکثر لوگ مزید ار مضامین کہنے کی غرض سے آتے ہیں۔ اس لئے وعظ میں ترہیب و ترغیب کے مضامین ہوں۔ یہ چار کام ان کے سپرد ہوں۔ اور ان کی تنخواہ اہل شہر خود اپنے ذمہ لیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے دیکھئے جس مقام پر طبیب نہیں ہوتا۔ اہل شہر چندہ کر کے ایک طبیب کو بلاتے ہیں اور تنخواہ دیتے ہیں تو کیا باطنی امراض کا ازالہ بدنی امراض کے برابر بھی ضروری نہیں ہے۔ یہ دستور العمل تو مردوں کے لئے

ہے رہیں عورتیں ان کے لئے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر بہشتی زیور وغیرہ پڑھا کریں ۔ اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں بچوں سے کسی وقت بہشتی زیور کے مسائل سن لیا کریں ۔ اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر نیا کریں اور ان سے اسی سلسلہ کو جاری کریں یہ مختصر دستور العمل ۔ اس سے انشاء اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہو جائے گا اور محبت بھی بڑھے گی ، اور دین کی تکمیل ہوگی ۔ (وعظ آثار المحبۃ صـ۲۰)

۴۴ - قرآن شریف ایک متن ہے ، فقہ اور حدیث اس کی شرح ہے

قرآن ایک متن ہے ۔ حدیث و فقہ سب اس کے شروح ہیں اسی کو فقہاء نے کہا ہے القیاس مظہر لا مثبت تو حدیث و فقہ قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف بیان نہیں کیا ۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا تو ہوئے نہیں ، بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے ، کنجی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث و فقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلتے ہیں ، اس کی تو یہ شان ہے ۔

عبارا تنا شتی و حسنک واحد وکل الی ذالک الجمال یشیر

ایک محبوب ہے ، جس نے صبح کو دھانی جوڑا پہنا ۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا ۔ مگر عاشق کہے گا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من ہر انداز قدرا می شناسم ۔

کہ جو لباس چاہے پہن لے ، میں تو چال پہچان لیتا ہوں ، تو قرآن کا جو عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن ہی نظر آتا ہے مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی حضرت مولانا گنگوہیؒ سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آ کر حنفی ہو جاتا ہے ان حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتا تھا اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بسکہ درجاں نگار و چشم بیدارم توئی ہرچہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر شئی میں خدا نظر آتا ہے ۔ مگر معاذ اللہ یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہی ہیں ۔ استغفر اللہ بندہ بندہ ۔ ۔ ۔ ہے ، خدا خدا ہے جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث ، مولانا جامی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ ۔

ع " ہرچہ پیدا می شود از دور پندارم توئی "

کسی منکر نے مسخرہ پن سے کہا کہ " مولانا اگر خر پیدا شود " ، تو آپ نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ " پندارم توئی " ۔ (وعظ حق الاطاعت صـ۱۲)

۴۵ - آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے

آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا ۔ اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں ۔ مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے دو وجہ سے ، ایک اس لئے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا ۔ یا فرض و واجب نہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیال کرے گا ۔ یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے ۔ دوسرے اس لئے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں ۔ جن پر نہ مطلع ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارے میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجہ میں ہے ۔ غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ہے ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو ۔ عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں اور وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے ۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ اور رسول نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلا دیا

جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کرتا ان کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا ہوں اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جاں نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر اکتفاء نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو بھی کام ہو وہ میرے ہاتھ سے ہوجائے وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دبائے گا پنکھا بھی جھلے گا اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے سامان مہیا کرے گا، اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کریں۔ نہیں بلکہ اس کی محبت اور جاں نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق

صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جاں نثاری کا علاقہ ہوتا۔ تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفاء نہ کر سکتے بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہوجاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق معلوم ہوجاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے یا کم، عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے رکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ بھی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب[1] وحبس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہوجاتا، اور رخ پھیر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ کبیدہ خاطر ہو، یا بے رخ ہوجائے۔ اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب وحبس بھی ہو تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کے نسبت یہ معلوم ہوجائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے۔ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کرلیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہوگیا ہے، گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال

---

[1] ضرب مارپیٹ، حبس قید کرنا۔

ہی تعلق کی دلیل ہے۔ میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ کیا بڑا گناہ ہے؟ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لئے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی۔

تعلقات میں درجۂ کمال

اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہوگیا۔ اور یہ بات ایک درجے میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ ع:۔

ع:۔ "بلا بودے اگر اینہم نبودے"

مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہوسکتی۔ آخر آپس میں جو ایک دوسرے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔ دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے حالانکہ وہ ایک نہایت ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو، بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لئے وہ کام کئے جاتے ہیں اور وہ زیورا اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو، اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زائد کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جاوے، چنانچہ مرد کے ذمہ بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے زیورا اور ریشمی لباس ضروری نہیں نہ اس کی دوا دارو لازم ہے، نہ اس کے کنبے والوں کی ضیافت دعوت ضروری ہے مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ اور اسکے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے حالانکہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اسکا منقطع ہوجانا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منقطع ہوجاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لئے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف

تعلق میں تو نفس تعلق پر تو قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا نہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے ہرگز نہیں۔ پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن	صبر چوں داری ز رب ذو المنن ۔
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں	صبر چوں داری ز نعم الماہدون

کمزور تعلق پر افسوس نہیں

ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے صبر نہیں ہو سکتا مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آگیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا۔ پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے مگر ضعیف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں، یہ تو کفار ہیں۔ ان سے اس وقت خطاب نہیں۔ یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی قدر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند رہا۔ مگر منیۃ المصلی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہو، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہئے ہیں کہ ضروریات کو بجا لائیں۔ تو کیا دنیا میں ہم اپنے مربیوں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں۔ ہرگز نہیں، دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی بہت کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں اس قدر اکتفا کرتے ہیں۔ جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ہمارا فرض کیا ہے

یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی اطاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس کے حق کے مقابلے میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحبات میں ہماری کوتاہی کا۔ کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لئے زیادہ کوشش کریں، مگر یہ سخت غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضیٰ حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایا و تحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہو سکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہدیہ دینا موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ یا تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو۔ پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق عمل تو کرنا چاہیئے۔ اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لئے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

کسی مصلحت سے ترک مستحبات

یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے۔ مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے کہ یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقاء کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔ ان لنفسك عليك[1] حقاً ولعينك عليك حقاً الخ او کما قال مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے کیونکہ یہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللّٰهم[2] انی اعوذ بك من العجز والكسل خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو ترک

---

[1] یقیناً تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے اور تیری آنکھوں کا حق ہے۔

[2] اے اللہ مجبوری اور کاہلی سے تری پناہ چاہتا ہوں ۱۲۔

مستحبات وتقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔ اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق عمل کر چکا ہو اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو جاکر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت وہمت کے موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا عمل کر کے چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے۔

مستحبات بھی ضروری ہیں

غرض حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے اس کے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے ہر کام کا ہر جزو ضروری ہے چونکہ قرآن میں مستحبات کا ذکر بھی ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلا دیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے برکات وثمرات بے شمار ہیں چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں کیونکہ جو شخص تہجد واشراق کا پابند ہوگا وہ بنسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار تہجد گذار مشہور ہو جاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ (ذم النسیان ص۳)

۴۶ - عوام کے لئے ترجمہ قرآن شریف دیکھنا مضر ہے

ایک ملاجی میرے پاس مترجم قرآن لائے (جس کو عام لوگ مترجم کہتے ہیں جیسے میرے ایک عزیز دیوان متنبی کو متبنی کہتے تھے) وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا تھا جس میں محاورہ کی زیادہ رعایت کی گئی ہے اس میں فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم کا یوں ترجمہ کیا گیا ہے کہ دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو اور اپنے پیروں کو "ورجس میں لفظ " اپنے پیروں کو" واقع میں مونہوں اور ہاتھوں کے ساتھ لگتا ہے جو کہ دور ہے نہ کہ اس فقرے سے کہ " ملو اپنے سروں کو"، جو کہ نزدیک ہے مگر وہ ملاجی قریب کے سبب ہی سمجھے کہ یہ قریب سے متصل ہے۔ تو اب وہ ترجمہ دکھلا کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ قرآن سے تو پاؤں کا مسح

ثابت ہوتا ہے۔ میں بڑا گھبرایا کہ اس جاہل کو کیونکر سمجھاؤں نہ یہ عطف کو سمجھے نہ اعراب کو تو میں نے اس سے کہا کہ ملاجی تم نے یہ کیونکر معلوم کیا کہ یہ قرآن ہے اور خدا کا کلام ہے۔ کہا علماء کے کہنے سے۔ میں نے کہا اللہ اکبر علماء اس میں تو ایماندار ہیں کہ وہ ایک عربی عبارت کو قرآن کہدیں اور اس میں ایماندار نہیں کہ وہ پاؤں دھونے کو فرض کہیں۔ بس علماء نے فرمایا کہ پیروں کا دھونا فرض ہے اور مسح کرنا جائز نہیں اور نیز یہ بھی کہا ہے کہ تم جیسوں کو قرآن کا ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔ - - - - - - - - - - خبردار جو تم نے کبھی آئندہ ترجمہ دیکھا۔ بس قرآن کی تلاوت کیا کرو، ترجمہ ہرگز نہ دیکھو۔

ایک بڑے میاں کا واقعہ

اس سے بھی بڑھ کر ہمیں ایک بڑے میاں ملے جو بڑے تہجد گذار اور پابند اوراد تھے مگر قرآن کا ترجمہ دیکھ کر گمراہ ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ جب میں قرآن پڑھا کروں تو لفظ راعنا چھوڑ دیا کروں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا جس کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ اے ایمان والو "رَاعِنَا" مت کہا کرو، تو کیا تلاوت کے وقت راعنا نہ پڑھا کروں، میں نے ان سے کہا کہ راعنا کو تو مت چھوڑو مگر آج سے قرآن کا ترجمہ دیکھنا چھوڑ دو۔ کیونکہ تم کو سمجھنے کی قابلیت نہیں۔

صاحبو! ایسے ہی لوگوں نے شریعت کا ناس کیا ہے جو ترجمہ قرآن وحدیث کا دیکھ کر مجتہد بن گئے ہیں اب اگر ان کی کم لیاقتی کے سبب ان کے شبہات کا جواب نہ دیا جائے بلکہ ان لوگوں کو ترجمہ دیکھنے سے منع کیا جائے تو بعضے یوں کہتے ہیں کہ علماء کو ہمارے سوالات کا جواب نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں افسوس آپ کو سمجھنا نہیں آتا۔ جواب تو ہر سوال کا۔ . . . . ہے مگر یہ بتلاؤ کہ اس کا سمجھنے والا کون ہے ؎

سیوف حدادیا لوی بن غالب مواض ولکن این السیف ضارب

صاحبو! آپ یہ اعتراض علماء پر نہیں کرتے بلکہ خود اپنی عقل پر اعتراض کر رہے ہیں مگر آپ کو خبر نہیں۔

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد۔

جیسے ہمارے یہاں ایک عورت عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہوئی اور اس سے پہلے اس نے اپنے بچہ کا پاخانہ کپڑے سے پونچھا تھا جس میں سے کچھ نجاست اس کی انگلی کو لگی رہ گئی۔ عورتوں کی عادت ہے کہ وہ ناک پر انگلی رکھا کرتی ہیں اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی تو وہ کہتی ہے۔ اوئی اب کے چاند کیسا سڑا ہوا نکلا۔ یہی حال ان جہلاء کا ہے جو علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتے۔ بلکہ ان کو اپنی خبر نہیں کہ اس میں جواب کے سمجھنے کی

اہلیت نہیں۔ بھلا اگر ایک سائنس کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقالے کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائنس نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم یہ کیا بکتا ہے۔ تو بتلائیے تصور کس کا ہے یقیناً سائنس کی عقل کا قصور ہے۔ مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی بکتا ہے جیسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زمانے میں وعظ ہوا ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہتی ہے جانے کیا کیا بھونکے ہے واقعی اس کے نزدیک تو سارا بھونکنا ہی ہوا۔ فرمایئے اس نے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا وعظ پر کیا اسی طرح اگر میں ان ملاجی کو علمی قاعدہ سے نہ سمجھا سکا تو قصور کس کا ہے ان کی عقل کی تو یہ حالت تھی کہ مہتمم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھدیا کرو ایک دن آپ چراغ لے کر گئے۔ تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا۔ آپ اس سے کہتے ہیں۔ میاں مولوی صاحب آنکھیں بند کرلینا میں چراغ رکھونگا۔ جی ہاں وہ تو آپ کو کپڑا پہنے ہوئے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو ننگا دیکھ لیں۔ اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ ارجلکم کا تعلق وجوھکم وایدیکم سے ہے یہ منصوب معطوف ہے مجرور پر عطف نہیں ہے۔ جس شخص کو قواعد نحو سے کچھ بھی مس نہ ہو وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا۔ اسی طریقہ سے اس کے احکام بھی معلوم کرو۔ تم کو خود معانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کر اپنے کو ماہر نہ سمجھیں جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔ (تواسی بالحق حصہ اول ص ۹)

(۴۷) قبولیت دعا پر شبہ کا جواب

جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک[۱] یہ ہے کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے۔ دوسرے[۲] یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کردیا جائے۔

صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے۔ آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک[۱] یہ کہ اپیل لے لی جائے اور اس میں غور کیا جائے۔ اور یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی ہے اس شخص کی جس کی اپیل لی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد دوسرا[۲] درجہ کامیابی کا یہ ہے کہ اپیل منظور کرلینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کردیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کردیا جائے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ "اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ" منظوری کی قسم اول پر محمول ہے۔ قسم ثانی پر محمول نہیں۔ جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے "اِنِّیْ قَرِیْبٌ" پر، اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور قرب تعلق کا مقتضا یہی ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو، موافق ہو یا نہ ہو، کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہوگا۔ یا سائل کی مصالح پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روداد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضیٰ صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کے ساتھ سنے۔ اور اس کے فیصلے کے واسطے لے لے پس "اُجِیْبُ" کے یہ معنیٰ ہوئے کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے۔ بے توجہی نہیں کی جاتی۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کے لئے بہت سی تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ کہ بادشاہ ہماری درخواست کو لے لے اس کے بعد جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہوگا ورنہ نہیں۔

لہ میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔

دعا کی قبولیت کی شکلیں

ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہیئے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو ضروری پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا یہ اس واسطے کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں تو کسی قانون کے پابند نہیں۔ ہاں بندے کی مصالح پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کا پورا کرنا اس کے لئے مضر نہ ہو۔ سو یہ تو عین کامیابی ہے۔ دیکھو بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سُن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سُن لی۔ اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھالیگا۔ جس سے نقصان پہنچے، یا بازار جانے سے عادت خراب ہوجائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کے کوئی چیز خود اپنے ہاتھ سے چار آنے کی خرید کر دیدیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جاوے گا کہ درخواست پوری نہیں کی۔ ہرگز نہیں کہا جاوے گا۔ بلکہ یوں کہا جاوے گا گو صورۃً پوری نہیں کی مگر حقیقتاً درخواست پوری کردی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں قادر بھی ہیں، رحیم و مہربان بھی ہیں۔ باپ ماں سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں اس کے بعد بھی جو کبھی طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیئے کہ ضرور ہماری درخواست کا بجنسہٖ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے۔ حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کردیتے ہیں اور اس جگہ کچھ اور نہیں دیتے۔ اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالح کے خلاف تو نہیں اور اسی صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

اجابت دعا کا معنیٰ

پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جاوئے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہوجاویگا ورنہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء۔ بعض علماء نے اُجیب دعوۃ الداع کو بھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذافت میں شمار کیا ہے۔ مگر

میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] یہاں سباق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب امر پر ضروری ہے۔ اس میں "ان شاء" کی قید خلاف ظاہر ہے نیز یہاں بھی اِنِّیْ قَرِیْبٌ کے بعد اجیبُ دعوۃ الدّاع کو بیان فرمانا جس میں قرب کو محقق و مؤکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ اجابت مشیت کے ساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قریب ہونا محقق ہے علماً بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ لِقولہٖ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ[2]، وَہُوَ المُرادُ بالتعلق۔ پس میرے نزدیک اجیب بالمعنی الاول نہیں۔ ہاں بالمعنیٰ الثانی ان شاء سے مقید ہے۔ جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ تحقیق نہ ہو تو وہ دعا میں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موہوم پر بھی بہت سے کام کرلیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہوجاوے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے۔ اور دعا میں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے۔ دعا میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہوجاتا ہے۔ جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کرکے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا۔ پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہٖ حاصل نہ ہو تو یہ بات اسی وقت حاصل ہوجاویگی کہ دل میں قوت و اطمینان حاصل ہوگا۔ اور یہ برکت اسی کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو خاص تعلق ہوجاتا ہے۔ عشاق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے۔ اور کچھ مطلوب نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ازدعا نبود مراد عاشقاں ... جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

اسی لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سُن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہوجائے تو مزید عنایت ہے تو چاہیئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے۔ بغیر

---

[1] تیرے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔

[2] میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی۔

اس کے خاص تعلق پیدا کیا جائے بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے۔ صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا۔ اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں۔ بس ہم دور ہو رہے ہیں۔ (الاصابۃ ص۲)

۴۸۔ عمل کے بغیر کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

باب عمل میں آج کل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جن کو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال ہے وہ عمل کو مہتم بالشان ہی نہیں سمجھتے، اس لئے ان کو اصلاح عمل اور تکثیر اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت[۱] کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا ہم کو بھی انکار نہیں۔ واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے مؤخر ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے۔ کیا جو چیز کسی سے مؤخر ہو وہ بیکار ہوا کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے مؤخر ہے۔ مگر بایں ہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بارآور نہیں ہو سکتا۔ جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہوں بارآور نہ ہوگا۔ مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں۔ مگر کیفیات خود مطلوب نہیں۔ باقی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا ہے کہ بدون عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرہ مقصودہ کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جاوے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کرنی ہے۔
هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم

[۱] لڑائی۔

کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ۔ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔ ایک مقام پر ارشاد ہے اَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔ ایک جگہ ارشاد ہے اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (المجاہدۃ ص۳)

۴۹ مجاہدہ کو ضروری نہ سمجھنا غلطی ہے

بعض لوگ اعمال کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ساتھ کسی اور شئی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبت[۱] اعمال کے لئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا۔ حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کے لئے ایک اور شئی کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے۔ اور نہ عادۃً۔ اس معنی کر موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے، لیکن اس معنی کر ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل بسہولت نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے گو صدور عمل بغیر اس کے ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدون ریل کے بسہولت طے نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل بتکلف بدون اس خاص شئی کے ہو سکتا ہے مگر بسہولت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سہولت اعمال کے لئے اس خاص شئی کی ضرورت ہے مجھے اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے معنیٰ معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں حاصل اس شئی کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گو ارادہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس

[۱] ہمیشگی۔

ارادہ کے کچھ موانع مزاحم ہوجاتے ہیں جس سے صدور عمل دشوار ہوجاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور عمل کی نوبت آجاتی ہے تو سہولت کے لئے اس شئے کی ضرورت ہوئی۔ اس شئی کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہوجاتا ہے اور میں اس کو تجربہ سے ثابت کرتا ہوں ابھی آیات سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معنی بھی محتمل ہیں۔ اسلئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں اور پھر بعد میں تبرعاً[1] آیات سے تائید کردوں گا۔ سنئے اس شئی کا نام ہے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس۔ یہ بات بہت قابل تدبر ہے اس کو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اس کی ضرورت معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو سب لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک[2] الصلوٰۃ سے ان کا دل بھی بُرا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ باوجودیکہ سب کا عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعضے ارادہ کرکے پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق[3] سے مضمحل ہوکر موثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پر دوام[4] نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ صدور و دوام اعمال کے لئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیف کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شئی کی ضرورت ہے جس کے بعد صدور و دوام و رسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شئی مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اس واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا . . . اتباع کرتا ہے۔ اور اس کو آرام دیتا ہے اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ (المجاہدہ ص۲۴)

۵۰ انبیاء علیہم السلام پر تکالیف آنیکی وجہ

اہل حق کا تو یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ حشویہ[5] نے انبیاء کی قدر نہیں کی۔ وہ ان کو معصوم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ حشویہ کا یہ قول نقل کے خلاف تو ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کرکے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدۂ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے شخص کو نبوت کا عہدہ دیدیا جاتا ہے کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں۔ عقل کبھی اس کو باور

[1] احسان کے طور پر [2] چھوڑ دینا [3] رکاوٹیں [4] پابندی [5] ایک فرقہ ہے۔

نہیں کرسکتی بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہوجائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم ورضا زیادہ ہو۔ وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہے۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب۔ میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی وہ غایتِ انقیاد و تفویض سے یوں کہتے تھے ؎

اے حریفانِ سلطہا رابستہ یار — آہوئے لنگم واو شیر شکار۔
غیر تسلیم و رضا کو چارۂ — درکفِ شیر نر خونخوارۂ۔

اور یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

فرقہ وحشویہ کی حماقت

یہ وحشویہ کی حماقت ہے کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کرلیا اور کہدیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں ان سے بھی گناہ ہوجاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے۔ اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدال حق آگاہ شد
گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمی — درمیاں فرقے بود بے منتہا
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

ایک شخص نے اس پر یہ میں اضافہ کیا ہے ؎

شیر آں باشد کہ آدم می خورد ۔ شیر آں باشد کہ آدم را خورد ۔

صاجو آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا۔ گو دبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا ۔ بھاگنا چاہے گا۔ اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو لے کر بغل میں دبائے اور زور سے دبائے ۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا۔ ہرگز نہیں ، بلکہ یوں کہے گا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں ، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے ۔ اور عشاق کی یہ حالت ہے ؎

خوشا وقت شوریدگمان غمش ۔ اگر تلخ بنیند وگر مرہمش

گدایانِ از بادشاہی نفور ۔ بامیدش اندر گدائی صبور

دمادم شراب الم درکشند ۔ اگر تلخ بینند دم درکشند

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے ۔ حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے ۔ (اکبر الاعمال ص۱۴۰)

۵۱ جہلا کی اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی ہوئی چیز بعینہ مردہ کو پہونچتی ہے ،

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لئے خیرات کیا کرتے ہیں خاص کر وہ چیزیں جن سے مرنے والوں کو رغبت تھی اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہونچے ، انہوں نے اس عمل کے لئے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے ، پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے

والے کا محبوب مرغوب خیرات کیا جائے ۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے "مما تحبون" فرمایا ہے "مایحبون" نہیں فرمایا ۔ پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہیئے نہ کہ مردہ کا محبوب ، اور راز اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے محبوب کے انفاق میں ، یہ تو ان کے استدلال کا جواب تھا ۔

خیرات ہونیوالی چیزوں کا ثواب پہونچتا ہے

اب میں وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں مردوں کو وہ بعینہ نہیں پہونچتی بلکہ اس کا ثواب پہونچتا ہے ۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہونچتا ۔ بلکہ تمہارا خلوص و اخلاص پہونچتا ہے ۔ اور اسی ہی کا تم کو ثواب پہونچتا ہے اور وہی ثواب مردوں کو پہونچا دیا جاتا ہے جب کہ ان کی طرف سے قربانی یا اور کوئی خیرات کی جائے اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ محرم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا مبنیٰ یہی خیال ہے کہ شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے ، اس لئے شربت پہنچانا چاہیئے کہ پیاس نہ بجھے ۔ سو اوّل تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے ۔ شربت ہرگز نہیں پہنچتا ۔ دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی تو خلاف ہے ۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہیں ۔ یہ اعتقاد آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی انشاء اللہ تعالیٰ شراب طہور کا وہ جام مل چکا ہے جس سے پہلی بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ بھی جاتی رہی ۔ اور اس اعتقاد فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے ۔ تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت لوگ بیمار ہو جاتے ہیں کسی کو نمونیہ ہو جاتا ہے خدا بچائے ایسی پابندئ رسم سے اور غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سمجھے ہی ہوتی ہے ۔ (دار المسعود ص۸)

خیرات کی جانیوالی چیزیں مردہ کو نہیں پہونچتی ہیں

جس کا مبنیٰ یہ خیال ہے کہ جو چیز خیرات کی جاتی ہے مردہ کو وہی پہونچتی ہے سو یہ خیال غلط ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مبنیٰ یہ حسرت ہے کہ ہائے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا ۔ جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی

کردو تاکہ اس کو پہونچ جائے ۔ منشاء یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحضار نہیں ہے اگر ہم کو بات مستحضر ہوتی کہ وہ تو نعمائے جنت سے محظوظ و مسرور ہو رہا ہے ۔ تو یہ حسرت ہرگز نہ ہوتی کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رُمانؔ و نخلؔ وغیرہ کا بیان فرمایا ہے ان کو دنیا کے نخل و رُمان پر قیاس نہ کیا جاوے ۔ نعمائے آخرت کو نعمائے دنیا سے محض اسمی مشارکت ہے ۔ ورنہ حقیقت میں وہ اور چیزیں ہیں برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے ۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے راجہ محمود آباد نے وائسرائے کی دعوت میں ایک انار تیار کرایا تھا جو دو سو روپے میں تیار ہوا تھا اس کی صورت اور نام تو انار کا تھا ۔ مگر حقیقت میں وہ اور چیز تھی خود قرآن شریف میں ارشاد ہے - - - - - قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۔ کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں ورنہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی جس میں نگاہ آر پار ہو جائے گی ۔ دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں ۔ تو اب تم اس دنیا میں ہو کہ مُردے یہاں ہوتے اور مردے اس تمنا میں ہی ہیں کہ تم وہاں ہوتے ۔ خدا جانے یہاں کیا رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں ؎

زر و نقرہ چیست تا مفتوں شوی
چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی

حوریں اور ان کے دوپٹے

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو ۔ حدیث میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی نفیس خوبصورت اوڑھنیاں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاند و سورج ماند پڑ جائیں وہاں کی حوریں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے سے ان کا بدن جھلکتا ہے جنت کی مٹی جواہرات اور مشک کی ہے ۔

حوض کوثر کا پانی

حوض کوثر کے پانی کی تعریف یہ ہے ۔ من شرب منہ شربۃ لا یظمأ بعدھا ابداً ۔ جس نے اس میں سے ایک دفعہ پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس ہی نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون پیاس کے بھی اس کی رغبت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا ۔ دنیا کے پانی میں پیاس کے وقت تو مزہ آتا ہے بدون

۱؎ انار ۲؎ کھجور ۔

پیاس کے مزہ نہیں آتا ۔ جنت کے پانی کی یہ شان ہے کہ ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے لئے پیاس کی کلفت دفع ہو جاوے گی اور بدون پیاس کے اس کا مزہ حاصل ہوگا ۔ بتلاؤ دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس کے اس سے مزہ آئے ۔ اس پر تمام نعمتوں کو قیاس کر لو کہ ان کی رائے جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض نام کی مشارکت و مشابہت ہے ۔ اب یہ حسرت کرنا کہ ہمارے مُردہ عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے سراسر حماقت نہیں تو اور کیا ہے ۔ ارے ان نعمتوں کو ان کے سامنے رکھو تو شاید ان کو قے آنے لگے ۔ (ایضاً ص۱۰)

۵۲ اس شبہ کا جواب کہ مشائخ بعض مرتبہ نااہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اجازت کے وقت اہل ہو پھر نااہل ہوگیا ۔ اور ایسا ہونا مستبعد نہیں اسی لئے عقائد کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے ۔ ایک تو یہی کہ السعید قد یشقیٰ ایک آدمی کبھی شقی بھی ہو جاتا ہے اور یہ اہل سنت کے عقائد میں داخل ہے (العبد الربانی ص۲۵) تو یہ امر موجب اعتراض نہیں ۔ کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہوں بعد میں شقی ہوگئے ہوں اور یہ الواصل لا یرد کے خلاف نہیں ۔ کیونکہ اس مسئلہ میں واصل فی الواقع مراد ہے نہ فی زعم الشیخ باقی الواصل لا یرد کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے ۔ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے بخاری کی ایک حدیث میں ہرقل کا قول مذکور ہے ۔ ولکن الایمان اذا خالط بشاشۃ القلوب کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں پیوستہ ہو جاتی ہے تو ارتداد ممکن نہیں ۔ اس قول کو حضرات صحابہ رضی نے بلا نکیر نقل فرمایا ہے کسی نے اس پر کلام نہیں کیا ۔ پس تقریر صحابہ رضی سے یہ مسئلہ ثابت ہوگیا ۔ دوسرا جواب اس اعتراض کا اور ہے جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نااہل میں حیاء و شرم کا مادہ دیکھ کر اسے اس امید پر مجاز کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کی تربیت کرے گا تو اس کی لاج اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا ۔ پھر بعضے نااہل شیخ کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں مگر ایسے کم نکلتے ہیں ۔ غالب حالت یہی ہے کہ جس میں

حیا و شرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضروری کرتا ہے (ایضاً ص ۲۶)

۵۳ اس اعتقاد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے اختیار سے باہر ہے!

یہ اعتقاد بالکل غلط ہے اور صراحۃً نصوص کے خلاف ہے گو اس مخالفت نصوص پر جو جہل کی وجہ سے ہے میں ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ تو نہیں دیتا مگر جہل شدید ضرور کہا جاوے گا قرآن میں نصوص بھری . . . ہوئی ہیں جن سے نجات آخرت کا داخلِ اختیار ہونا صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ جس میں مسابقت الی الجنۃ کا امر ہے۔ اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم "سَابِقُوْا" کیوں ہے معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلف فرمایا کرتے ہیں، غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں فرمایا کرتے، نص میں موجود ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا شاید یہ شبہ ہو کہ جنت و دوزخ ہم کو تو نظر نہیں آتی جو اس میں کود کر پہونچیں یا کود کر باہر نکل جائیں یا دور بھاگ جائیں۔ پھر اس کی طرف سبقت کس طرح کی جا‌ئے یا دوزخ سے کیونکر بچا جائے۔

فعلِ اختیاری کے ۲ دو معنیٰ ہیں

تو سمجھ لیجئے کہ کسی فعل کے اختیاری ہونے کے دو معنیٰ ہیں ایک یہ کہ بلا واسطہ اختیاری ہو جیسے کھانا کھانا اختیاری ہے، پانی پینا اختیاری ہے دوسرے یہ کہ بواسطہ اختیاری ہو۔ یعنی اس کے اسباب اختیاری ہوں۔ جیسا کہ خورجہ سے دہلی پہونچ جانا اور کلکتہ یا بمبئی پہونچ جانا اسی معنیٰ کر اختیاری ہے۔ کیونکہ یہاں سے بمبئی کو د کر کون پہونچ سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو اختیاری کہا جاتا ہے جس کے یہی معنیٰ ہیں کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، یعنی مسافت قطع کرنا۔ اور غور کر کے دیکھا جائے تو زیادہ افعال اختیار یہ اسی دوسری قسم کے ہیں۔ مثلاً نکاح کر کے بچے جنوانا۔ زراعت سے غلہ حاصل کرنا۔ تجارت سے نفع حاصل کرنا اختیار ہی ہے تو کیا ایسا

ایسا اختیاری ہے کہ آپ بلا واسطہ جب چاہیں حاصل کرلیں۔ ہرگز نہیں بلکہ اسی معنیٰ کر اختیاری ہے کہ اسباب اختیار میں ہیں اسباب کو اختیار کرو، اُمید ہے کہ مسبب حاصل ہو جائے گا۔

جنت میں جانا اختیاری

پس جنت میں جانا بھی اس معنیٰ کر اختیاری ہے کہ اس کے اسباب آپ کے اختیار میں ہیں۔ قرآن و حدیث کو دیکھو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے لئے اسباب و تدابیر بتلائی ہیں ان کو اختیار کرو، پس خدا تعالیٰ تم کو جنت میں پہونچائیں گے۔ اور دوزخ سے بچا دیں گے چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ، اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب دخول نار ہے اور سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے بعد ارشاد ہے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ موجب دخول جنت ہے۔ پھر تقویٰ کی تفصیل قرآن میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اس میں انفاق و کظم غیظ و عفو و احسان کا بیان ہے

تقویٰ کا بیان

دوسری جگہ ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ - - وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنیٰ کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے دل علیہ قولہ لیس البر ان تولوا وجوھکم الی آخرہ۔ جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنا لیا تھا اس کے بعد ایمان باللہ ایمان بالمعاد اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بکتب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے۔ یہ تو اعتقادات کے متعلق ہے پھر حب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت الٰہیہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے یہ طاعت بدنیہ

غصہ کا پی جانا

ہے۔ پھر ایتاء زکوٰۃ کا یہ طاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایتاء مال کا ذکر ہوا ہے۔ وہ انفاق تطوع ہے۔ جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے ان فی المال لحقاً سوی الزکوٰۃ ثم تلا الآیۃ (اور علیٰ حبہ اس کا قرینہ بھی ہے۔ کیونکہ اگر اس کا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کیلئے فقط ایتاء زکوٰۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہیئے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الٰہی کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے) اس کے بعد ایفاء عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے اس لئے اولٰئک ھم المتقون پر اس کو ختم فرمایا ہے۔ تو اب بتلایئے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدابیر تلائی ہے یا نہیں۔ اور یہ تدابیر اختیاری ہیں یا نہیں۔ تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں۔ رہا یہ کہ تدابیر تو حق تعالیٰ نے تلائی ہیں مگر ان پر عمل کرنا اور ان کا بجالانا تو مشیت پر موقوف ہے بدون مشیت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بے شک یہ ہمارا عقیدہ ہے مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں کھیتی کرنا ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر ان کے لئے کیوں سعی کی جاتی ہے۔ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے ؎

رزق ہر چند بیگماں برسد — لیک شرط است جستن از درہا

اور مرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر سانپ بچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی ہے اس کے متعلق یوں کہتے ہیں ؎

اگرچہ کس بے اجل نہ خواہد مرد — تو مرو در دہانِ اژدہا

توکل اور اس کی حقیقت

یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے دنیاوی امور میں بھی کیا ہوتا۔ میں توکل کو منع نہیں کرتا بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جس کو آپ نے توکل سمجھا ہے وہ توکل نہیں ہے توکل کے یہ معنیٰ نہیں کہ اسباب و تدابیر کو قطعاً ترک کر دیا جائے بلکہ طریقہ حقہ یہ ہے کہ تدبیر و تقدیر دونوں کو ملایا جائے۔ یعنی کام کر کے توکل کرنا چاہیئے ؎

گر توکل می کنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

دنیا میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ کھیتی کر کے ثمرہ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو۔ خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور ثمرہ میں توکل کرو۔ چنانچہ دنیوی معاملات میں سب کا یہی طرز ہے مگر نہ معلوم یہ تجزیہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور ثمرہ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہو۔ حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو معاملات دنیا میں اختیار کر رکھا ہے ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہیئے بلکہ اگر غور کیا جائے تو دنیا و آخرت کا فرق اس کو مقتضی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی گنجائش ہے اور مقاصد اخرویہ میں ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی مطلقاً گنجائش نہیں کیونکہ توکل بمعنیٰ ترک اسباب کی حقیقت ہے۔ ترک اسباب مظنونہ غیر مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترک عادۃً یقینی و قطعی نہ ہو اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہوں ان کو ترک کر دیا جائے باقی جن اسباب پر عادۃً مسببات کا ترک یقینی ہے ان کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائے گا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں کہ اللہ میاں کو منظور ہو گا تو جیٹ خود بخود ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص بھوکوں مر گیا تو عاصی ہو گا۔ اور اسباب مظنونہ کا ترک بھی اس کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل و عیال بھی یا اس کے اہل و عیال ہی نہ ہوں۔ اور ضعیف الہمت کو یا جس کے عیال ضعیف ہوں اس کو ان کا بھی ترک جائز نہیں۔ اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں

آخرت کیلئے سعی کرنا

جب توکل کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سوچیئے کہ ثمرات آخرت کے لئے جو اسباب شریعت نے بیان کئے ہیں وہ کیسے ہیں۔ آیا مامور بہا ہیں یا نہیں۔ سو ظاہر ہے کہ مامور بہ ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب شرعاً ضروری ہے یا مظنون تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا اور ارشاد ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، اور بہت سے نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کے متعلق صریح وعدہ ہے کہ جزا ضرور مرتب ہو گی۔ اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے گو ہر چیز کے لئے اسباب موجود ہیں چنانچہ حدیث میں ہے ماجعل اللہ داء الاجعل لہ دواء اور اسی واسطے تدبیر مشروع ہے مگر ان پر ثمرہ مرتب ہونے کا حق تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اس لئے کبھی تخلف بھی ہو جاتا ہے کہ کھیتی کرتے ہیں اور پیداوار نہیں ہوتی دوا کرتے ہیں اور شفا نہیں ہوتی۔ اور نہ اس پر عادۃً ترتب اثر ضروری ہے اور نہ یہ شرط ہے

کا یہ خیال۔

ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہو سکے یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہو جائے بخلاف اعمال آخرت کے کہ ان کو اپنے ثمرات کے ساتھ علیت و شرطیت دونوں کا علاقہ ہے گو یہ علیت و شرطیت عقلی نہ ہو۔ شرعی ہی ہو، تو لزوم ترتب میں اعمال آخرت کی سب کی وہ حالت ہے جو دنیا میں بعض اسباب قطعیہ یقینیہ کی حالت ہے جن پر عادۃ ترتب اثر ضروری ہے جیسے اکل پر شبع[1] کا اور شرب پر ری[2] کا مرتب ہونا بلکہ وعدہ و عدم وعدہ کا تفاوت سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق[3] ہیں۔ پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں۔ کیونکہ وہ سب اسباب قطعیہ یقینیہ ہیں جن پر ترتب اثر کا بعض میں وعدہ بھی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں وہاں تو چھوٹی سے چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے کہ تخلف کا احتمال ہی نہیں وہاں توکل اختیار کر لیا ہے پس دنیا و آخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ دنیا کے تو بعض اسباب میں توکل جائز ہو اور آخرت کے کسی سبب میں بھی جائز نہ ہو۔ یہ تو اسباب کا حکم تھا۔ رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے خواہ ثمرہ دنیا میں یا ثمرہ آخرت میں۔ یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو۔ (دوا ء الغفار ص۱۰)

۵۴ اختلافِ رُویت کی صورت میں روزہ کون سی تاریخ کا افضل ہوگا

خوب کہہ لو کہ تمہارا یہی خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے بھی پندرہ ایک ہی ہوگی گو حساب میں پندرہ ایک ہو۔ مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمانہ میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جاتے کہ دوسرے مکان میں یا زمان میں اس کی فضیلت کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہر جگہ رات اور ہر دن میں اس کی فضیلت کو پیدا کر سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ امکان سے وقوع تو لازم نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارے واسطے ہے وہی برکت دوسروں

[1] آسودگی [2] سیرابی [3] زیادہ چپکنے والا

کے لئے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق پندرہ سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو برکت کا ایک رات سے دوسری رات میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے۔ ان کی شان تو یہ ہے۔ اُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ کہ حق تعالیٰ گناہوں کو حسنہ بنا دیتے اور جرم کو طاعت کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں کہ کیوں تو نے ایسا کیا تھا تو نے فلاں گناہ کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گنائیں گے بندہ سب کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین گناہوں کا تو ذکر ہی نہیں ہوا دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کبائر کے ذکر سے پہلے ہی یہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوائیگا کہ الٰہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے ہیں ان کا یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں دلوایئے یہ تو آخرت میں ہوگا اور دنیا میں یبدل اللہ سیئاتہم حسنات کا مصداق یہ ہے کہ ملکات سیئات کو مبدل بہ ملکات حسنات کر دیتے ہیں بخل و سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں، اور حسنات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم فرعون پر عذاب دم مسلط ہوا تھا اور خون کو دودھ بنا دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بخواہد عین غم شادی شود — عین بند پائے آزادی شود
کیمیا داری کہ تبدیلش کنی — گرچہ جوئے خون بود تبدیلش کنی

واقعی حق تعالیٰ سے زیادہ کیمیا بنانے والا کون ہوگا جب تم کیمیاوی تدابیر سے تانبے کو سونا اور رانگ کو چاندی بنا دیتے ہو تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے چونکہ سونا چاندی اور سب دھاتیں زمین ہی سے نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مٹی ہی سے کیا کیا بنا دیا۔

…س کے یہاں جو تاریخ ثابت ہو وہی برکت ہے

رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کے لئے دوسری نصوص موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے لئے اسی تاریخ میں برکت ہے جو ان کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے۔ حدیث میں ہے۔ الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحیٰ

یوم تضحون ۔ ترجمہ : روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی کرو اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کر دو یا تحقیق کر کے روزہ ختم کر دو تو خدا کے نزدیک وہی روزہ اور افطار کی تاریخ ہے یعنی جو ثواب اور برکت ماہ رمضان وعید الفطر وعید الاضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے ۔ ہر شہر کے مسلمانوں کو ان ایام میں حاصل ہوگی جو ان کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں ۔ لہذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے وہی معتبر ہے اور اس دن سے پہلی رات تمہارے لئے پندرہویں رات ہے ۔ اختلاف تاریخ سے شبہ میں نہ پڑو (الیسر مع الیسر صـ۳۷)

۵۵ عورتوں کے اس عمل کی تردید کہ گھر میں میلی کچیلی رہتی ہیں اور باہر زیب و زینت کیساتھ

جو عورتیں اپنی راحت کے لئے یا اپنا اور اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لئے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں ان کو تو گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کیلئے پہنتی ہیں وہ گناہ گار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار بھنگوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب میں نکلیں گی نواب کی بچی بن کر جائیں گی ۔ جیسے لکھنؤ کے مزدور دن بھر تو لنگوٹا باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرائے کے کپڑے پہن کر جیب میں دو پیسہ ڈال کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک پیسہ کا تو پان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا گجرا گلے میں ڈالیں گے جیسے کسی نواب کے بچے ہوں ۔ اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں ۔ اس میں ان کی نیت کیا ہے ۔ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس ٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں ۔ بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لئے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ جو ایک جوڑا تم نے تقریب کے لئے نکالا تھا خاوند کی عزت کے لئے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا ۔

اب دیکھو کہ اگر تقریب میں پے در پے دو تین دن جانا ہو جاوے تو تم تینوں دن

اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی ۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر دن نیا جوڑا بدلا جاتا ہے آخر کیوں خاوند کی عزت کے لئے ایک ہی کافی تھا ۔ مگر نہیں ہر دن نیا جوڑا بدلتی ہیں اس لئے کہ ایک جوڑے میں ہر دن نہیں جا سکتیں اگر اور کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ ضرور ہی بدل لیں گی ۔ تاکہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو ۔ پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھلانے کی حرص ہوتی ہے بعض تو اسی غرض کے لئے ننگے سر رہتی ہیں تاکہ سب کو سر سے پیر تک کا زیور نظر آجائے اور جو ان میں سے مولون ہیں وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں مگر کسی نہ کسی بہانے سے وہ ابھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں کہیں سر کھجلاتی ہیں کہیں کان کھجلاتی ہیں ۔ یہ ریا ہے اور اس غرض سے قیمتی کپڑا پہننا یا زیور حرام ہے ۔ ایک مرض عورتوں میں یہ ہے کہ جب یہ کہیں محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پیر تک تاک لیتی ہیں تاکہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ زیور نہیں رکھتی ہے اور ہم کسی سے گھٹے ہوئے تو نہیں ہیں یہ بھی اس ریا اور تکبر کا شعبہ ہے یہ مرض مردوں میں کم ہے ۔ اور اگر دس آدمی ایک جگہ مجتمع ہوں تو مردوں میں سے کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کس کا لباس کیسا ہے اس لئے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے ۔ اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس بیوی کے پاس کتنا زیور تھا اور لباس کیسا تھا ۔ یاد رکھو اس غرض سے قیمتی لباس پہننا جائز نہیں ۔ (عزیب الدنیا صـ۲۹)

۵۶ مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے !

وہ اپنے ذمہ کو صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارے ذمہ ان کے دین کا بھی کوئی حق ہے مثلاً گھر میں آکر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں ۔ مگر یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز پڑھی پڑھی یا نہیں اگر کھانے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں ہے تو خفا ہوتے ہیں یا تیار تو ہو گیا مگر مرضی کے موافق تیار نہیں ہوا تب بھی خفا ہوتے ہیں اور کبھی یہ معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی نہ بیوی پر خفا ہوتے ہیں ۔ بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے تو بہت سے مردوں کو اس کی بھی

پرواہ نہیں ہوتی اور جو کبھی کسی کو خیال بھی ہوتا ہے تو یہ وہ ہیں جو دیندار کہلاتے ہیں اور وہ بھی یوں ہی چلتی سی بات کہدیتے ہیں کہ بی نماز پڑھا کرو۔ نماز کا ترک کرنا بڑا گناہ ہے۔ بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک سبک دوش ہوگئے اور جب کسی نے ان سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو نماز کے لئے تنبیہ کیوں نہیں کرتے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ کہہ تو دیا تھا اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتلایئے کیا آپ نے نماز کے لئے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا اور اگر ایک دو دفعہ کے کہنے سے اس نے نمک کی درستی کا اہتمام نہ کیا ہو تو کیا وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہوجاتے ہیں جیسے نماز کے لئے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ ہرگز نہیں۔ نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے کو آمادہ ہوجاتے ہیں اور ایسی بری طرح خفگی ظاہر کرتے ہیں کہ بی بی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہیں اس لئے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے۔ صاحبو! نماز کے لئے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا جس سے بی بی سمجھ جائے کہ میاں بہت ناراض ہوگئے ہیں اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی۔ اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے پھر نہ پڑھتی تو تیسرے وقت پھر کہتے اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے مثلاً پاس لیٹنا ترک کر دیتے یا اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھاتے۔ جیسا کہ نمک کی تیزی پر اگر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہوجاتے بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں اور وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہدیا ہے اب بھی وہ نہیں مانتی تو میں کیا کروں۔ بس خاموش ہوجاؤں۔ صاحبو! انصاف سے بتلایئے کہ ہم نے کبھی کھانے پینے کے باب میں بھی اپنے جی کو اسی طرح سمجھالیا ہے جیسا نماز کے باب میں سمجھالیا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں یہ تو سراسر کوتاہی ہے اگر آپ بی بی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ دشوار بات نہیں کیونکہ عورت حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ چنانچہ اپنی غرض کے لئے ان پر حکومت کی بھی جاتی ہے مگر دین کے لئے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔

(حقوق البیت صہ۶)

۵۷ زنانہ اسکولوں کا قیام عورتوں کیلئے زہر قاتل ہے

بعضے آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد بیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق وجذبات کا آدمی میں ضرور اثر آتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع ومعظم بھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی وبیباکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا حیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح[1] ہے تمام خیر کی۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے، ہر چند کہ اذا فاتك الحياء فافعل ما شئت یعنی جب تجھ سے حیا جاتی رہے تو کر جو جی چاہے حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک " ما شئت " کا عموم نساء کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں پھر بھی عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور ہم مکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اس کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہوگیا ہوگا جن کا اس وقت بے تکلف شیوع ہے۔ ایک لڑکیوں کا عام زنانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو معلمہ مسلمان ہی ہو اور پردہ نا ڈیوں ہی میں ہو اور گو یہاں آکر پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلا دیا ہے اور تجربہ کرا دیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہوجاتے ہیں کہ جن کا ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کریلا اور نیم چڑھائی کی مثال صادق آجاتی ہے۔ اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی بروزانہ یا ہفتہ وار نگرانی تعلیم یا صنعت سکھلانے کے بہانے سے اختلاط

[1] کنجی

ہونے لگا تب تو نہ آبرو کی خیر ہے نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعضے لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو آفات مجسمہ سے بچی تو بچی اور اور تابع ہو کر تو کیا ذکر کسی بڑی بڈھی مسلمان عورت کا متبوع ہو کر بھی عمر بھر میں ایک بار ہم کلام ہونا بھی خطرناک ہے۔ جن مضرتوں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ

اسلم طریق لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آئیں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور باا‌ثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ استانی تنخواہ سے ملے۔ اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں۔ تو پڑھانے کا تو یہ طرز ہوا۔ اور نصاب تعلیم ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جائے۔ پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزاء دین کی مکمل تعلیم ہو میرے نزدیک اس وقت بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرمناک ہوں ان کو چھوڑ دے اور اپنی بی بی کے ذریعہ سے سمجھا دے اور اگر یہ نظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لیں گی۔ یا اگر عالم شوہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرالیں گی (چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو ٹائیٹل پر مطبوع ہوا ہے اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔

خصوصی مسائل

مگر بعضے لوگ اس کو دیکھتے نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھا دے اس لئے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا کیسی کچی سمجھ ہے) بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھ دیا ہے جن کا پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھیں تو ضروری مقدار پڑھ کر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام رکھیں کہ ان کو تدریس کا شوق ہو تاکہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تحریص ہوتی رہتی ہے اور اس کی ترغیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی غافل نہ ہوں اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں

قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں۔ اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں۔ یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی

لکھنا بھی سکھایا جائے

رہا لکھنا تو اگر قرائن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے بچنا جلب مصالح غیر واجبہ سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھائیں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے۔ (حقوق البیت ص۲۸)

۵۸ ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے

مجھ سے ایک سوال کیا گیا کہ ماں باپ کا حق زیادہ ہے یا پیر کا۔ تو میں نے یہی جواب دیا کہ ماں باپ کا زیادہ حق ہے البتہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق[1] یعنی اگر پیر شریعت کے موافق حکم کرے اور ماں باپ اس کے خلاف کہیں تو اس وقت پیر کی اطاعت ہو گی والدین کی نہ ہو گی یعنی پیر ہونے کی وجہ سے۔ سو پیر کی اس لئے وقعت ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر چلاتا ہے حق کے اعتبار سے نہیں۔ حق کے اعتبار سے والدین کا مرتبہ خدا کے بعد ہے اور پیر بھی آجکل اپنے کو مالک سمجھتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نواح میں تو موروثی پیر بھی کچھ بہت زیادہ برے نہیں۔

پیروں کا حال

پورب میں ایک پیر تھے وہ عورتوں کے پاس جا کر ٹھیر جاتے تھے خدا ایسے پیروں کو غارت کرے اس کے ساتھ وہ بڑے بزرگ اور قطب اعظم مشہور تھے اور کئی لاکھ آدمی ان سے مرید ہیں۔ ہندو بھی ان سے مرید ہیں اسلام اور درویشی میں پہلے عموم و خصوص مطلق کی نسبت تھی مگر اب اس زمانہ میں من وجہ کی نسبت ہو گئی یعنی پہلے درویشی کے لئے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ اب کافر بھی صوفی اور درویش ہو سکتے ہیں۔ یہ ان رہزنوں کی بدولت ہے۔ ان کے نزدیک کافر بھی مرید ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دجال پر ضرور ایمان لے آدیں گے

[1] اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

کیونکہ وہ تو بڑا صاحب تصرف ہوگا۔ اور چونکہ ان کے نزدیک صوفی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے دجال کو تو بے تکلف پیشوا بنالیں گے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاں شریعت نہیں وہاں کچھ نہیں اس کے نزدیک کرامات وغیرہ کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ سب سے پہلے اتباع شریعت کو دیکھے گا۔ اور چونکہ دجال کافر ہوگا اس لئے یہ شخص اس کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

صاحبو! دجال قریب ہی نکلنے والا ہے اس لئے جلد اپنے عقیدہ کی درستی کرلو! اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے بلکہ علامات و آثار بتلاتے ہیں کہ دجال کا زمانہ خروج قریب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ احتمال تھا کہ کہیں میرے ہی زمانے میں نہ نکل آوے اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے زمانے میں نکل آوے۔ اس لئے اپنے عقائد درست کرلو۔ جس کو خلاف شریعت دیکھو اس کے ہرگز معتقد نہ بنو۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔

آجکل کے پیر مریدوں کو غلام سمجھتے ہیں

غرض آجکل پیر سمجھتے ہیں کہ مرید ہماری مملوک ہیں ماں باپ اور بیوی سب سے چھڑا دیتے ہیں۔ یاد رکھو اگر پیر کہے رات کو نفلیں پڑھو۔ اور باپ کہے سو رہو تو باپ کی اطاعت مقدم ہے ہاں اگر باپ شریعت کے خلاف کوئی حکم کرے تو اس وقت باپ کی اطاعت جائز نہیں۔ شریعت کا لحاظ مقدم ہے۔ اور ماں باپ کا اتنا حق ہے کہ جریج ایک درویش تھے بنی اسرائیل میں۔ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ پہلی شرائع میں رہبانیت کا حکم تھا۔ ہماری شریعت میں یہ مطلوب نہیں۔ اس کے متعلق آجکل کے اعتبار سے ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ تنہائی سے جو غرض ہوتی ہے جنگل میں رہنے سے آجکل وہ حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایسے شخص کو لوگ بہت ستاتے ہیں برخلاف اس کے اگر کوئی مسجد کے حجرہ میں رہے اسے کوئی نہیں پوچھتا دوسرے سب کو چھوڑ کر تنہا عبادت کرنا کمزوری کی بات ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں　　کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

ہمت کی بات یہ ہے کہ سب میں ملے جلے رہو اور پھر اپنے کام میں لگے رہو۔ حدیث میں ہو۔ المومن القوی خیر من المومن الضعیف اور اگر جنگل میں کوئی نہ ستاوے تو بہتر

ۃ قوی مضبوط مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے

ہے کچھ مضائقہ نہیں مگر حدود شرعیہ سے تعدی کرنا حرام ہے۔ خوب کہا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا　　ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہ صفا　　تواں یافت جز بر پئے مصطفےٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر کے حاصل کرو جو حاصل کرنا ہو۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر پوری نظر نہ ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھو وہ آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نما ہیں۔

حضرت جریج صوفی کا واقعہ

غرض جریج ایک عابد تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنی عبادت گاہ میں نماز نفل پڑھ رہے تھے کہ ان کی ماں نے آکر پکارا۔ یہ سخت پریشان ہوئے کہ جواب دوں یا نہ دوں۔ جواب دوں تو نماز جاتی ہے نہ دوں تو ماں کی خفگی کا اندیشہ . . . . . آخر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دو تین آوازیں دی اور بد دعا دے کر چلی گئی کہ اللھم لا تمتہ حتیٰ تریہ وجوہ المومسات کہ اے اللہ جب تک یہ کسی زانیہ کا منہ نہ دیکھ لے اس کی موت نہ آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکایت بیان فرما کر ارشاد فرمایا۔ لوکان فقیھاً لاجاب امہ، اگر فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتا۔ اور یہ قول اس کا قرینہ ہے کہ نماز نفل تھی کیونکہ فرض کو بالاجماع توڑنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر کسی پر مصیبت آوے مثلاً جلنے لگے یا گرنے لگے تو اس وقت اس کے بچانے کے لئے نماز فرض بھی توڑنا واجب ہے خواہ ماں ہو یا کوئی غیر ہو۔

صاحبو! آپ نے شریعت کی تعلیم کو دیکھا۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت کا قانون ہے آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں اس لئے کچھ قدر نہیں کرتے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

شریعت کا حسن و جمال

شریعت تو ایسی حسین و خوبصورت ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو دلربا ہے جس ادا کو دیکھو دلکش ہے۔ آپ

ملاحظہ کیا کہ کس قدر ضرورت کے قوانین ہیں کہ جب کسی کو گرفتارِ مصیبت دیکھو تو نماز فرض بھی توڑ دو اور ایسے موقع پر پہونچو۔ اور نفل میں تو اگر بلا ضرورت بھی ماں باپ پکاریں تو نیت توڑ دینا چاہئے بشرطیکہ ماں باپ کو اطلاع نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے مگر جریج چونکہ فقیہ نہ تھے اس لئے جواب نہ دیا اور ماں کی بد دعا لگ گئی اور یہ واقعہ ہوا کہ قریب ایک آوارہ عورت تھی۔ اس کو کسی کا حمل رہ گیا۔ کچھ لوگ جریج کے دشمن تھے انہوں نے اس سے کہدیا کہ تو جریج کا نام لے دینا کہ اس کا بچہ ہے۔ اس کمبخت نے ایسا ہی کیا لوگ اس کے عبادت خانے پر چڑھ آئے اور اس کو توڑنے لگے اور جریج کو پیٹنا چاہا۔ اس نے پوچھا کہ اس حرکت کا آخر کچھ سبب بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے تو ریا کار ہے۔ عبادت خانہ بنا کر زنا کرتا ہے۔ فلاں عورت سے تو نے زنا کیا ہے اس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔

عبادت کا اثر

یہ عبادت خانے سے اترے۔ آخر اللہ کے مقبول بندے تھے رحمت خدا کو جوش ہوا اور ان کی ایک کرامت ظاہر ہوئی۔ حضرت جریج نے اس کے لڑکے سے پوچھا کہ بتلاؤ تو کس کا ہے۔ اس نے کہا میں فلاں چرواہے کا ہوں۔ یہ قصہ حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے ماں کا کتنا بڑا حق معلوم ہوا مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر پیر پکارے تو نماز نفل کا توڑنا بھی جائز نہیں۔ تو پیر کا حق ماں باپ سے زیادہ نہیں۔ اور یہ اچھے پیر صاحب ہیں کہ دوسرے کے پالے پلائے پر قبضہ کر لیا۔ کیا پیری مریدی کے یہی معنی ہیں۔ (وعظ عضل الجاہلیہ ص۵۹)

۵۹ چھوٹے بچہ کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں نے ایک ذرا سی لڑکی کو روزہ رکھوا دیا اور وہ جب پاخانہ گئی تو ایک ساتھ گئی۔ غرض چاہے بچہ کی جان پر بن جائے مگر روزہ ضرور رہو۔ مگر بعض دفعہ یہ روزہ روضہ میں بھی لے جاتا ہے۔ ایکمرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا گرمی کے دن تھے۔ دوپہر تک تو بیچارہ نے بنا دیا۔ مگر عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا۔ رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا۔ تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی۔ آخر بہلایا کہ تھوڑی دیر اور صبر کرو مگر اس بے چارہ کو تاب کہاں تھی اول تو اس نے لوگوں کی

منتیں خوشامدیں کیں مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا۔ اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا۔ آخر وہ خود اٹھا۔ رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ مٹکوں میں برف بھری گئی تھی وہ مٹکے سے لپٹا کہ کچھ تو پانی سے قرب ہو۔ اور لپٹتے ہی جان نکل گئی۔ اس کا وبال بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

صاحبو! شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے۔ مگر اہل رسوم کے نزدیک معصوم بچہ کو بھی اجازت نہیں۔ افسوس! خدا کو ایسے روزہ کی ضرورت نہیں خدا تو تم سے زیادہ تم پر رحمت کرنے والا ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تم سے زیادہ شفقت ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ توجب مکلف کو یہ حکم ہے کہ ایسے وقت روزہ دے تو چار پانچ برس کا بچہ کس شمار میں ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شریعت میں اتنی شفقت و سہولت ہے کہ تم بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں کر سکتے۔

(عضل الجاہلیہ ص۵۹)

۶۰ فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟
حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ اور ارفع نمونہ ہیں

(۱) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کی ذات مبارک میں ایک اچھا نمونہ دیا ہے۔ نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے۔ یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نمونہ کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ۔ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی۔ غرض طول بھی برابر سلائی یکساں۔ غرض کہیں قصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی۔ جب وہ اچکن لیکر مالک کے پاس پہونچے گا۔ تو مالک اسے کیا کہے گا۔ وہ اچکن خوش ہو کر لے گا یا اس کے سر سے ماریگا

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوائے گا۔

احکام میں نبی کریم ﷺ کے عمل کی موافقت ضروری ہے

خوب یاد رکھو کہ حق تعالیٰ نے احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہیں اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ سو اگر آپ کے اعمال نمونہ کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں۔ اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے۔ دیکھئے نماز میں بجائے دو کے ایک سجدہ کرلے تو وہ نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔ کوئی قرآن شریف بحالت جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے۔ اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الٰہی توقیفی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں۔ اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ علیٰ ہذا حج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج حج نہیں اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہوسکتا۔ یہ ارکانِ اسلام ظاہری ہوئے۔ اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے۔

فرشتے رسول بناکر کیوں نہیں بھیجے گئے

حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کسی فرشتے کو رسول بناکر نہیں بھیجا۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی۔ ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو پڑھ کر سنا دیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا۔ کہ ایک کتاب ہمارے اوپر اتر آتی۔ اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس کو ہم آپ پڑھ لیتے اور عمل کرلیتے۔ فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہوسکتی تھی۔ حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر

بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں۔ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں تمدن اور معاشرت کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں۔ اور وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیل کرکے دکھلا دیں تاکہ ہم کو سہولت ہو۔ اسی واسطے فرمایا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ یعنی ہم نے جس قدر تیرے سے پہلے پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھانے پینے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا۔ یعنی اگر ہم فرشتے کو احکام لیکر بھیجتے۔ تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا۔ ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہوسکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔

سید المرسلین ﷺ کا انتخاب

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن حکمت الٰہی اس کی مقتضی ہوئی کہ آپ نسل انسانی سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں۔ دیکھ لیجئے کہ جتنی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیاں رکھیں، اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غمی کی تقریبیں بھی ہوئیں کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کون سا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے۔ کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے کہ ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماردی جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھجیاں کرکے مالک کے سامنے جا رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔ واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہی ہوگئی ہے کہ جو طریقہ ان کا تبلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دور ان اعمال کو تباہ کرکے اور دھجیاں اڑاکے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھدیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی، کپڑے کی کوئی غرض بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بیکار ہوگا۔ جیسے

کوئی کپڑے کی دھجیاں کرکے اچکن سینا چاہے (وعظ منازعۃ الہویٰ ص۶۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

(ب) یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور آپ کے حالات کو اپنے حالات پر، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے۔ بشر لا کالبشر ولکن کالیاقوت بین الحجر۔ آپ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کے مانند نہیں ہیں بلکہ آپ انسانوں میں ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت ہوا کرتا ہے کہ جنس کے اعتبار سے تو وہ بھی پتھر ہی ہے مگر زمین و آسمان کا فرق ہے یاقوت میں اور دوسرے پتھروں میں۔ اب اگر کوئی محض اشتراک جنس کی وجہ سے یاقوت کو اور پتھروں پر قیاس کرنے لگے تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ عقل پر پڑیں پتھر۔ لہذا محض انسان سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس نہ کیا کرو۔ کیا انسان سارے یکساں ہی ہوا کرتے ہیں دیکھو ایک آدمی تو حبشی کالا بھجنگا ہے آدمی تو وہ بھی ہے اور ایک حسین یوسف ثانی ہے وہ بھی آدمی ہی ہے مگر کیا دونوں برابر ہیں اور کیا ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے ہرگز نہیں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ اگر کسی نے آدمیوں میں صرف اس یوسف ثانی کو دیکھا ہو اس کے بعد پھر حبشی کو دیکھے تو وہ ہرگز یقین نہ کرے گا کہ یہ بھی آدمی ہے بلکہ اس کو جن یا دیو سمجھے گا کیونکہ اس کے نزدیک تو آدمی اسے کہتے ہیں جو اس حسین کے مشابہ ہو۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں کہ آپ کے دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم تم بھی آدمی ہیں وہ تو نہ معلوم ہم کو کیا سمجھے گا کہ یہ گدھے ہیں یا بیل ہیں اب یہاں تین فرقے ہو گئے بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے حضورؐ کو بشر ہی نہ سمجھا۔ وہ تو خواص الوہیت کو حضورؐ کے لئے ثابت کرنے لگے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے آپ کو بالکل ہی اپنا جیسا بشر سمجھا یہ دونوں غلطی پر ہیں اور ایک فرقہ متوسط ہے جو حضورؐ کو بشر تو سمجھتا ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے۔ اور وہی بات کہتا ہے۔ بشرؐ لا کالبشر بل کالیاقوت بین الحجر۔ واقعی سچی بات ہے ؎

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر / ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمے / درمیاں فرقے بود بے منتہا

(وعظ ابوار الیتامیٰ ص۲۶)

؎ بشر ہیں مگر عام بشر کی طرح نہیں بلکہ جیسے پتھروں میں یاقوت ہوتا ہے۔

۶۱ بعض جدید تعلیم یافتوں کا حال اُن سے مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے کہ آج کل جن لڑکوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں بعضے ان میں سے جدید تعلیم کے اثر سے ایسے آزاد منش ہوتے ہیں کہ ان کو دین ایمان سے بھی کچھ علاقہ نہیں رہا۔ زبان سے کلمات کفر بک جاتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ پھر انہیں میں سے ایک سے مسلمان لڑکی کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور سب گھر والے خوش ہوتے ہیں کہ ایک مسنون طریقہ ادا کیا جاتا ہے اس سنت کی صحت کے لئے موقوف علیہ ایمان۔ افسوس ہے کہ نوشہ صاحب نہ جانے کتنی دفعہ اس سے خارج ہو چکے ہیں اب وہ مثال صادق آتی ہے یا نہیں کہ کپڑے کے پرزے پرزے کر کے بلکہ جلا کے اچکن سینے کا ارادہ کیا جاتا ہے ہم کو تو اسی کا رونا تھا کہ اچکن نمونہ کے موافق نہیں سی جاتی۔ ایک آستین بالشت بھر کم کی جاتی ہے یہاں نہ آستین رہی نہ دامن اور خیال یہ ہے کہ اچکن تیار ہے۔ ایک نیک بخت لڑکی ایک انگریزی خواں سے بیاہی گئی جو ایک مجمع میں یہ لفظ کہہ رہے تھے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی بہت بڑے ریفارمر تھے اور مجھ کو آپ سے بہت تعلق ہے لیکن رسالت میں ایک مذہبی خیال ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ کلمہ کفر ہے نکاح اس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر لڑکی والوں کو بتلایا جاتا ہے تو الٹے لڑنے کو سیدھے ہوتے ہیں کہ ہمارے خاندان کی ناک کٹواتے ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دیکھ لیا جاوے کہ داماد مسلمان ہے یا کافر بجائے اس کے پہلے دیکھا جاتا تھا نیکوکار ہے یا بدکار۔ اس قصہ سے میرے قول کی تصدیق ہو گئی کہ ہمارے اعمال خراب ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم ان کو اچھے سمجھ کر اجر کے امیدوار بیٹھے ہیں ؎

وسوف تری اذا انکشف الغبار ⁘ افرس تحت رجلک ام حمار

(غبار چھٹ جانے کے بعد ظاہر ہوگا کہ تم گھوڑے پر ہو یا گدھے پر۔)

(وعظ منازعۃ الہویٰ ص۶۵)

۶۲ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہونے کی تمنّا؟

فرمایا کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو اچھا ہوتا میں کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے ہم لوگوں کا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ ہونا ہی اچھا ہوا کیونکہ ہم لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے خدا کی راہ میں مال دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شب و روز امتحان درپیش تھا کبھی زکوٰۃ کا حکم ہوتا تھا کبھی جہاد میں جان دینے کا، عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ سو ہماری ایسی طبیعت والے اگر احکام نبوی کے بجالانے میں کوتاہی کرتے۔ تعجب نہ تھا کہ انکار نبوت تک نوبت آجاتی۔ جس کا انجام کفر و خسران دارین تھا۔ دوسرے خدا جانے معاصرۃ کہیں اپنا رنگ نہ لاتی اور اب تو جمع کی کرائی شریعت ہم کو مل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات ہم نے سُن لئے حضور کی عظمت بھی قلب میں بلامزاحم موجود ہے اگر خدانکردہ خلاف بھی کریں گے تو کسی خطاب جزئی کا تو خلاف نہیں ہے۔ ان لوگوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے عمر سے ہر حالت میں دیکھا۔ آپؐ ان کے معبودوں کو بُرا کہتے تھے آپ کی قرابت بھی لوگوں سے تعلقات تھے بہت سے امور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسے پیش آتے تھے جو لوگوں کے خلاف جمع ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے کمال ان کا تھا نہ کہ ہم لوگوں کا۔

(مقالات حکمت، دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۶۳ لوگوں نے غفور رحیم کے معنیٰ غلط سمجھے!

خدا غفور رحیم ہے۔ توبہ استغفار کرلیں گے گناہ معاف ہوجائیں گے مگر دنیا کا نفع یعنی مکان بنانا بغیر رشوت کے نہیں ہوسکتا اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے۔ اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی۔ پس جس نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے اس کو گوارا کرکے رشوت لینا چاہیئے۔ پھر خدا سے معافی کرالیں گے۔ تو صاحبو! آپ نے

دیکھ لیا کہ نفس بدخواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیرخواہی کی صورت میں لاتا ہے۔

طوطے کی مثال

مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے اپنے طوطے کو لفظ دریں چہ شک سکھلا دیا تھا وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہدیا کرتا تھا مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بن بھی جاتا ہے۔ چنانچہ اس شخص نے طوطہ کو یہ لفظ یاد کرادیا اور بر سر بازار لاکر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے ایک شخص نے اس کا امتحان لیا کئی باتیں اس سے کیں سب کے جواب میں اس نے دریں چہ شک ہی کہا۔ مگر ان باتوں پر یہ جواب چسپاں تھا۔ اس نے خوش ہوکر اس کو خرید لیا۔ اور گھر پر لایا اب اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اس نے سب کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہا چاہے جوڑ لگے یا نہ لگے آخر اس نے جھلا کر کہا کہ افسوس میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بیوقوفی کی اس نے اس کے جواب میں بھی کہا۔ دریں چہ شک، کہ اس میں کیا شک ہے۔ ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے۔ ہر جگہ اس کا استعمال کرتا ہے وہ یہ کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو حق اللہ ہو یا حق العبد۔

غفور رحیم کا حاصل

دوسرے یہ احمق نہیں جانتا کہ غفور رحیم ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہوگا۔ اگر غفور رحیم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور رحیم ہیں دنیا میں بھی تو ہیں کیونکہ صفات باری سب قدیم ہیں۔ پھر سنکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ جو کچھ چاہو کرو کچھ ضرر نہ ہوگا تو سنکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا کے غفور رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا تو ایسے ہی آخرت میں بھی غفور رحیم ہوں گے اور گناہ کا بھی ضرر ہوگا کیونکہ غفور رحیم ہونے کے لئے ضرر نہ ہونا لازم نہیں خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو بتلا دیا کہ لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی وَلَاتَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً۔ یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرماکر سب کو بتلا دیا کہ طریق فلاح و رضا الٰہی یہ ہے ورنہ کام تو خود ہمارے ذمہ تھا کہ رضائے مولا کا طریقہ معلوم کرتے۔ دوسرے حق تعالیٰ نے حق جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقہ بیان فرمائے ہیں وہاں ایسے امور کی بھی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنیٰ ہیں جو میں آئندہ بتلاؤں گا۔ اور غفور ہونے کے یہ

بھی معنیٰ ہوسکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں۔ اگر کہئے کہ کیسی مغفرت ہے کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافات ہے۔ تو صاحبو! آپ نے نہ خدا کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں حاکم کی سرکشی کو۔ اور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے اسی قدر اس کی سرکشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سرکشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ ماننا۔ مگر اس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے غرض سرکشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی سرکشی کی گئی۔ ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے۔ دوسرا مقدمہ سب پہلے سے مسلم ہے کہ خدا سے بڑا کوئی حاکم نہیں کیونکہ اور سب کی تو عظمت محدود ہے اور عظمت الٰہی غیر محدود، خارج از . . . وہم و قیاس ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

خدا کی مخالفت

بس اب سمجھئے کہ جب خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں اور اسی کی مخالفت کی سزا سے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں ہوسکتی۔ تو جیسا عظمت غیر اللہ محدود ہے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الٰہی نامحدود ہے اس لئے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہیئے پس اس عقلی قاعدہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہوجائے تو چونکہ خدا کی نافرمانی ہے اس لئے اس کی سزا بھی ابدالآباد جہنم ہونی چاہیئے اور اس کے لئے کبھی مغفرت نہ ہونی چاہیئے مگر خدا تعالیٰ نے ابدالآباد جہنم سوائے مشرکین و کافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی۔ پس اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ ان کی مغفرت اور بخشش ہے یا نہیں یقینی ہے اور ضرور ہے اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا مستحق ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ پس نامحدود عذاب کے بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی نجات عطا فرما دیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا کہ غفور ہونے کے لئے سزا نہ دینا ضروری نہیں بلکہ غفور ہونے کے یہ بھی معنیٰ ہوسکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جائے اور غفور ہونے کی

ایک یہ بھی صورت ہوسکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور اس کی رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اور رحیم کے دوسرے معنیٰ سنیئے۔ وہ یہ کہ عرفاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جس کی خطا معاف کرتے ہیں اس کے لئے یہی بڑی بات ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لئے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں نہ کوئی مستحق انعام و اکرام سمجھے تو حق تعالیٰ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے خواہ مرے یا جیئے خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں مگر وہ رحیم بھی ہیں ان کی رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے جس میں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ فیہا مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔

خطا معاف کرکے مقرب بنانا

پھر یہ خطا معاف کرکے اس کو اپنا مقرب بناتے ہیں۔ کسی سے ہفتہ وار ملاقات ہوا کرے گی کسی سے ماہوار کسی سے سالانہ۔ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دو مرتبہ صبح و شام ملاقات ہوا کرے گی۔ پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں بلکہ حدیث میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ ان پر متجلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے السَّلام علیکم پس اس کی نظیر کوئی پیش کرسکتا ہے کہ خطا وار اور گنہ گار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہے تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے کہ خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر نہیں کہ ان کو بلا دیں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے جا کر متجلی ہوں گے اس کے وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے ؂ ۔

"امروز شاہاں مہماں شدت مارا"

تو دیکھئے خدا کی رحمت کے معنیٰ سمجھ میں آگئے اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہو تو یہ نفس کا بڑا دھوکہ ہے کہ حق تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی اسی کو کہتے ہیں۔ کلمۃ حق ارید بہا الباطل" اسی لئے میں کہتا تھا کہ نفس خیر خواہی کے پردے میں بدخواہی کرتا ہے۔ (وعظ وحدۃ الحب ص۵ پانچواں وعظ دعوات عبدیت حصہ ہشتم)

۶۴ جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں

غیر عالم کبھی وعظ نہ کہے۔ اس میں چند مفاسد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے اور آپؐ فرماتے ہیں "اذا وصل الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔" کہ جب کام نا اہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نا اہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامت سے ہے اور یہ امر مصرح وثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں۔ یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔ گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

جاہل واعظ کی خرابیاں

علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہدیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں۔ ضرور کچھ گھڑ مڑھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑجادیں۔ بعض جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو اور نہ جہل ظاہر ہووے۔

گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی رحؒ نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیر دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو

تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے ایک باب میں تو اس میں اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود وشرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا۔ (چنانچہ بعض غیر محقق مولوی وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہونچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں، گھبراتے ہیں۔ یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعیف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کردے تو اس پر پکا اعتبار ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہوجاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں۔ سو یہ غیر محقق خوب سمجھ لیں کہ یہ ضعف ایمان نہیں بلکہ ضعفِ طبیعت ہے

ضعف ایمان ضعف طبیعت

ضعف ایمان اور ہے اور ضعف طبیعت اور۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو۔ اور تنویر کے لیے جو مثال بیان کی جاتی ہے وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں۔ کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ تبلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت پورا بندوبست ہوگیا۔ اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوتا مگر خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے۔ یاؤ بھر دیں گے ناغہ نہ کریں گے۔ بلکہ مبہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے۔ اس کی کیفیت اور کمیت نہیں تبلائی گئی۔ ممکن ہے کہ تیسرے روز ملے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا وعدہ ہے کہ شام کا وقت تبلا دیا ہے تو ضعف ایمان کی وجہ سے یہ تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے جس کا باعث طبعی ضعف ہے اگر داعی کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو تو اس سے زیادہ تردد ہوجائے تو یہ کیا ظلم ہے۔ الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ضعفِ ایمان کا۔

(وعظ شعبان ص۱۴۸، دعوات عبدیت حصہ ششم)

سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ

مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً

چاندی کے بدلے چاندی۔ یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے۔ تفاضل کمی بیشی حرام ہے۔ اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کر دے گا۔ اور ممکن ہے کہ ایک وقت چاندی کا بھاؤ روپئے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنہ تولہ ہو جو ایک روپئے کے مقابلہ میں روپے کے وزن سے زیادہ آئے گی اور ان حضرات کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہو کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے۔ تو یہ حضرات یا تو خود روپئے کے برابر ہی لائیں گے پھر گھر والے ان کو بے وقوف بنائیں گے یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے۔ اور دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپئے میں روپئے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی تولو۔ زائد مت تولو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی۔ محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہدے گا کہ اگر چاندی ایک روپئے کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپئے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپئے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے آؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہو گی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئیگی باقی چاندی پیسوں کے مقابلے میں ہو جائے گی۔ اور پیسہ اور چاندی ہیں۔ جنس بدل گئی۔ اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔

طلاق کا مسئلہ

اب مسئلہ اطلاق و تقیید کی مثال سنیئے۔ مثلاً باب الکنایات میں فقہا نے لفظ اختیاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے۔ اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاوے گا۔ لیکن اس اختیاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختیاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کرے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اگر کوئی لفظ اختیاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کر دے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دیدے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی

کر چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں غلط فتویٰ دیا ہے۔

مطلق و مقید کا فرق

نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل فقہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب کو دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔ غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے۔ جاہل واعظ ضرور غلطی کرے گا۔ اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کہ کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ دو چار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے۔ مگر ہمیشہ محفوظ رہ جانا جاہل سے دشوار ہے۔ دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔ انشاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیئے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی عالم بھی بشر ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا۔ شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہو گی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم دوسرے وقت اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکتا ہے۔ اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہو گا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھ لو۔

صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بناء پر میں کرتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیئے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں تو وہ کہتا ہے۔ واہ ہماری بیوی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں اس نے شرح وقایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع نکال کر باہر بھیجدیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہو تو قربانی جائز ہے۔ اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے۔ گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا۔ کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح وقایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی

(وعظ الہدیٰ والمغفرہ صـ۴۰)

۶۵ عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا بڑی غلطی ہے

فرمایا کہ ہر عمل کا مدار اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لاکر رکھدیا۔ اب صرف اس کے اعتماد پر کھانا کھالیا جاتا ہے حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملادیا ہو۔ چنانچہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب دیکھئے یہاں پر زہر ملانے کا احتمال کا خیال نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا تاجر لوگ کروڑوں روپئے کی تجارت صرف ملازمین کے اعتماد پر کرتے ہیں حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سامال غبن کرڈالتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام نوکر چاکر ہی کے ذریعہ چلتاہے اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا علماء کے اعتماد پر ہے۔ اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر۔ پھر ان کو صحابہ کرام پر۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ ۔ ۔ ۔ دین کا ہو یا دنیا کا۔ سب کا دار و مدار اعتماد ہی پر ہے۔ اب عوام کو ہر امر دین میں دلیل تلاش کرنا غلطی ہے۔ (مقالات حکمت ۱۰۲ دعوات عبدیت حصہ ششم)

۶۶ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں جانا رحمت سے ہوگا نہ کہ عمل سے اس پر ایک شبہ کا جواب

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں نہ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہ ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود

ہی ہوگا رحمت حق کا اول تو تجزیہ نہیں ہوسکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمرات متناہیہ متناہی ہوتا ہے بہرحال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کرچکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص۔ اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔

سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا کیوں کہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اعمال ہر طرح کامل ہیں۔ مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہوسکتے چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمایئے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرمارہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا۔ تو پھر ہمارا کیا منہ ہے۔

(وعظ الحیوٰۃ ص ۱۸)

۶۷: حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمٰعیلؑ سے بوقت ذبح رائے دریافت کرنے پر ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یَاۤ اَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ کہ

اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ تردد تھا ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء ع میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا۔ جیسا کہ ان کے سوال مَاذَا تَرٰى میں اور ان کے جواب اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں صریح تنقیص ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا۔ اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کو کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا۔ اس واسطے وہ اس درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے۔ مگر اس توجیہ سے میرا رونگٹا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے۔ ؎

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را۔

ناتمام اس معنی کر کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی۔ نور محمدی کے جدا ہونے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزا ہے اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا اس کے منتقل ہونے کے بعد ابد الاباد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔ اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسمٰعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سنو! شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا۔ اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت

پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں "انشاء اللہ" کہ اگر خدا کو منظور ہو۔ پس یہی تو کمال ہے ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں۔

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر　　آبا از و مکرم و ابنا عزیز تر۔

تو یہ تھی اس کی اصل۔ چنانچہ اسمٰعیل علیہ السلام راضی ہو گئے ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لیکر ذبح کے لئے لٹایا۔ اسماعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم ع سے زیادہ نہیں۔ بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خودکشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا ہوگا۔ مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دے۔ والنادر کالمعدوم اب بتلایئے، استقلال کس کا بڑھا ہوا ہے ایک محتمل عبارت فانظر ماذا تری سے یہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا کتنی بڑی غلطی ہے اگر نور محمدی ص کے جدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے۔ تو اچھا پھر وہ چھری چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے۔ حضور ص کے نور کے برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ مفارقت بدن ابراہیم علیہ السلام کے بعد ویسا ہی نور بخش تھا۔ جیسا کہ مفارقت ناسوت کے بعد بھی ناسوت کے لئے نور بخش ہو رہا ہے جن انوار کا آپ مشاہد کر رہے ہیں۔

(روح الحج والثج ص۱۸)

۶۸ - مقتدا بنانے کے لئے عوام کا غلط معیار

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی [illegible]ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی۔ اور سبیل من اناب [illegible]سے علاج ہے اس جماعت کا ہر کس و ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں۔ اور اتباع کا [illegible]صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا صحیح معیار۔ ۔ ۔ [illegible]بلا دیا اور معیار سے مراد ہے معیار صحیح ورنہ یوں تو معیار آجکل بہت ہیں۔ جیسے کشف کہ [illegible]ض نے اسی کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا۔

بعض نے معیار بنایا کرامت کو۔ بعض نے وجد و سماع کو۔ بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر حرارت زیادہ ہو اور بہت روتا ہو۔ وہ بزرگ ہے۔ بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش ہوگیا۔ تو سمجھئے کہ بڑا بزرگ ہے۔ اور بعض نے معیار بنایا تجرد کو۔ گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر یہ معیار تو نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے۔ وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں۔ یہ ان کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے چنانچہ میرے یہاں ایک عورت کو جنون ہوا۔ تو اس کو کشف ہوتا تھا مگر جب مسہل دیا گیا تو اس کے ساتھ کشف بھی ختم ہوگیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مالیخولیا کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے۔ پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں۔

بزرگی کیا ہے؟

غرض بزرگی کے معیار عجیب و غریب مقرر کر رکھے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ اس فن میں کو جانتے نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا کہ اکثر ایسوں کے معتقد ہو جاتے ہیں اور بعضوں نے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ ان گھڑت باتیں بکیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص تھا۔ اس سے اکثر سٹے والے پوچھ جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑبڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی اس اصطلاح کے موافق اس کی بکواس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا۔ کہ کوئی شخص صوفی بن جائے۔ پھر اس کی ہر بات بزرگی ہوجاتی ہے خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں اور گالیاں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں۔

بی بی تمیزہ کا وضو

ایک دفعہ بزرگی رجسٹری ہونی چاہئے پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے۔ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو۔ مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نام کی ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کروا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا

جی ہاں پڑھا کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ نے کرا نہیں دیا تھا۔ سو جیسا اس کا وضو پکا تھا کہ بدکاری سے ٹوٹا نہ ہگنے سے نہ موتنے سے آجکل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہی ہیں۔

بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہو گیا پھر خلل نہیں پڑتا ہاں ایک صورت سے خلل پڑتا ہے شریعت کی بات بتلانے لگے ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو نرا ملا ہے۔ اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں اس کو کوئی معصیت گندہ نہیں کر سکتی یہ تو سمندر رہے۔ سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑ جائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی پاک ہوگا۔ سو یہ حضرت تو سر سے پیر تک گو ہی میں بھرے ہوئے ہیں ایک پیر صاحب اپنی مریدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سنتے سنتے آپ کو مستی سوار ہوئی۔ اور تخلیہ میں لے جا کر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہاں سے باہر آ کر فرماتے ہیں کہ جب آگیا جوش نہ رہا ہوش مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے۔ سبحان اللہ کیا اچھی بزرگی ہے۔ چاہے ایسا ہی کام کریں مگر پھر بھی بزرگ کے بزرگ۔ خلاصہ یہ کہ ملانوں نے وہ ذلت تلافی کی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا۔ اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اور اتباع کی شکایت تھی۔ پھر جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں۔ سو یہ وہ قصہ ہوا کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

(وعظ اتباع المنیب صفحہ ۲۰)

۶۹ - پیشوا بنانے کا صحیح معیار

سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ کا اتباع کرو۔ اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھے واتبع من اناب الی نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس میں ابہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی کہ وہ خود

متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے ۔ وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار۔ کہ جس شخص کا اتباع کرو۔ اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو۔ سبحان اللہ کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اس معیار کے موافق کرنا چاہیئے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ[1] کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے۔ اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب من اناب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو۔ اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو۔ بس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔ ایک علم دین اور عمل دین۔ اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں نہ عمل ہے نہ علم۔ اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہیئے اور پھر اس پر مرتب ہونا چاہیئے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور علم و عمل اور توجہ الی اللہ کی طرف اشارہ فرما دیا۔ بس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہو گا کہ جسمیں یہ تینوں باتیں ہوں۔

(اتباع المنیب ص۲۸)

۷۰ - بعض لوگ حج کے بعد بدعمل کیوں ہو جاتے ہیں ؟

بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے۔ اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ

[1] وہ اسکو اپنی طرف راہ دیکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے ۱۲

نیک ہو جاتا ہے اگر بدی تھی تو وہ بدی اب نکل جاتی ہے۔ بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد　　اے بسا خرقہ کو مستوجب آتش باشد
خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں　　تا سیہ روئی شود ہر کہ درو غش باشد

شاید تم کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے۔ نہیں صاحب حج کو جاؤ مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی کیمیا گر سے تعلق پیدا کر لو ۔

کیمیا ئیست عجیب بندگی پیر مغاں　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

کیمیا گر سے میری مراد یہ لنگوٹی باندھنے والے نہیں کہتے ہیں بلکہ باطن کے کیمیا گر مراد ہیں جن کو اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد　　فی الحال بصورت طلا باشد

پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا بن جاتا ہے۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے پارس میں یہ بات ہو یا نہ ہو اہل اللہ کی صحبت سے توبہ نصوح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام گندگیاں دُھل جاتی ہیں۔ پس تم کو چاہیئے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ۔ اس کی صحبت سے تم کو توبۂ خالص عطا ہو گی توبہ کر کے جاؤ گے تو پھر حج کا یہ اثر ہو گا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہو گی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مرید ہو کر جاؤ۔ اس کی ضرورت نہیں صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔ (محاسن الاسلام ص۳۷)

۷۱ - جب کہ بُری باتوں سے بچانا نماز کا خاصہ ہے تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے

اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں۔ اے صاحب! آپ کی نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سامنے ایک

اپاہج مضغۂ گوشت کو لاکر پیش کر دیں اور جب وہ کہے کہ میں اپاہج کو لیکر کیا کروں ؟ یہ بھی کوئی آدمی ہے ؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ صاحب تم نے آدمی کو کہا تھا میں نے آدمی لا دیا۔ دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے یا نہیں ؟ تو بیشک وہ معقولی آدمی تو ہے مگر معقول آدمی نہیں وہ اس قابل نہیں ہے جس سے آدمیوں کے کام لئے جائیں گے ۔

ہماری نمازیں

بس یہی حال ہماری نماز کا ہے کہ نام کو تو نماز ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پیر ہے نہ منہ ہے نہ سر ہے نہ آنکھیں۔ اگر ہاتھ ہے تو سر کٹا ہوا ہے سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں ۔ اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کالعدم سمجھتے ہیں جیسے اپاہج مضغۂ گوشت کو کالعدم سمجھا گیا تھا۔ مگر فقہاء نے یہ دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ اگر نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے اس پر صحت کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر یہ حکم صحت ویسا ہی ہے جیسے آپ نے اس اپاہج کو حیوان ناطق ہونے کی وجہ سے آدمی کہا تھا پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے مگر حقیقی نماز نہیں ہے ۔

صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو بیکار سمجھکر چھوڑ دیں ۔ نہیں صاحب بالکل بیکار یہ بھی نہیں ۔ نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بہتر ہے کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہو جاوے تو حق تعالیٰ کے یہاں صورت بھی قبول ہو جاتی ہے ۔ مولانا نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

ایں قبول ذکر تو از رحمت است چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یعنی جس طرح عورت مستحاضہ[2] کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے مگر محض رحمت کی بنار پر اس کو قبول کر لیا جاتا ہے ۔ یہی حالت ہماری تمام نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کالعدم ہیں مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہو جاتی ہے ۔ نیز بعض دفعہ شدہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہو جاتی ہے ۔ جیسے بعض طلبہ بدشوق ہوتے ہیں نہ مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں نہ پڑھکر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا نہ پڑھنے کے مثل ہے مگر

---

[1] گوشت کا لوتھڑا ۔ [2] وہ عورت جس کو حیض کے علاوہ استحاضہ خون آرہا ہے

شفیق استاذ اس کو مکتب سے نہیں نکالتا ۔ اور یہ کہتا ہے کہ گو یہ اس وقت شوقین طالب علم کے برابر نہیں مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے چنانچہ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ جن طالب علموں کو ابتدار میں شوق نہ تھا جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت میں خود بخود ان کو شوق پیدا ہو گیا انہیں اسباب پر نظر کر کے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا ۔ اور واقعی فقہار کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے پس آپ اپنی نماز کو بیکار تو نہ سمجھیں مگر کامل بھی نہ سمجھیں ۔

اعتراض کا جواب

اب اعتراض کا جواب ہو گیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ[1] ۔ اور ہم اپنے اندر یہ اثر نہیں پاتے تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے اور آپ کی نماز کامل نہیں ۔ اس لئے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ۔ ہم نماز کو بری طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جوشاندے کو سفوف بنا کر پھانک لے تو بتلائیے نفع کیونکر ہو ۔ دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی اس کی نہی عن الفحشار بھی ہے ۔ اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشار سے روکدیتی ۔ اب ناقص ہے تو کسی قدر فحشار سے روکدیتی ہے ۔ اور اس کا انکار نہیں ہو سکتا تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا کفار جس کو نمازی دیکھتے ہیں اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھکر کچھ نہیں کہتے ۔ اس سے وہ ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ ہمارے بہکانے میں نہیں آسکتا ۔ (انوار الیتامیٰ صلا)

۷۲ ۔ معراج میں دیدار باری تعالیٰ

دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے ۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا ۔ اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہو گا ۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے ۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالۂ رویت اُدھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے متحمل نہیں ۔ ورنہ حق تعالیٰ میں خفار نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی

---

[1] وہ بری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے ۔

صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے۔ ھُوَالظَّاھِرُوَالْبَاطِنُ پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفاء نہیں۔ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں خفاء ہے اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفاء ہے بلکہ غایت ظہور سے بطون ہوگیا رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہوگیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیئے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت[1] وخفاء کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک . . . . نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادراک التفات سے ہوتا ہے اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو۔ اس کی طرف التفات[2] نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں۔ اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو اسی طرح بلا تشبیہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت وخفاء کا نہیں۔ اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہوجاتی ہے اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے تو مگر ادراک نہ ہوتا۔ دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفاء نور ہی کا نام ہے۔ نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہوجاتی ہے ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم ۔۔۔ گر نیست غیبتے نہ دہد لذتِ حضور۔

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں۔ اسی لئے مخفا ہوگیا کیونکہ

دیدار الٰہی

ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہوسکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہوسکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہوجائے گا۔ تو ظاہر من کل وجہٍ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا۔ وہاں روح کا بھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہوجائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں

---

[1] پوشیدگی [2] توجہ

آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردۂ چشم
بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے سات پردے ہی دیدار سے مانع ہوگئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے مانع کوئی نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھ پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے لا یبقیٰ علیٰ وجھہ الّا رداء الکبریاء[1]۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں۔ آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا۔ اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں۔ ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم ہے۔ انکم لن تروا ربکم حتیٰ تموتوا۔ (تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم کو موت آجائے) اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لَنْ تَرٰنِیْ[2]۔ یہ جواب قابل دید ہے حق تعالیٰ نے لن ترانی فرمایا ہے لن اریٰ نہیں فرمایا۔ بتلا دیا کہ میں تو اب بھی قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگئے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الٰہی معراج میں ہوئی ہے۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں۔ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور

---

[1] اس کے چہرہ پر کبریائی کی چادر کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ [2] تو ہرگز مجھے نہ دیکھ سکے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول یہی ہے کہ آپ نے دیکھا ہے مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آیاتِ سورۂ نجم کی تفسیر اس حدیث سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ذُوۡمِرَّۃٍ۔ یقینا حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں ان صفات کا عنوانِ بیان اس کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شدید القویٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب آگے چلئے۔ فَاسۡتَوٰی وَهُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے کا مرجع جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں کیونکہ اِسۡتَوٰی بالافق بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے اس کے بعد ثم دنا فتدلّٰی فکاب قَوۡسَیۡنِ اوادنیٰ میں سب ضمیریں جبرئیل علیہ السلام ہی کی طرف راجع ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ورنہ انتشار ضمائر لازم آئے گا یہ رویت جبرئیل تو دنیا میں ہوئی تھی آگے فرماتے ہیں۔ وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَهٰی۔ یہ دوبارہ رویت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے وہ دو مرتبہ ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا۔ **ھو جبرئیل**۔ یعنی یہ رویت جبرئیل علیہ السلام کی تھی، باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ رویت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ آپؐ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول تو مسلم میں ہے۔ اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوع نقل کی ہے بس قرآن میں گو اس رویت کا ذکر نہیں۔ مگر جب یہ حضرات صحابی رضی اللہ عنہم اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ

اب ان علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رویت محال عادی ہے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالۂ رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں مگر شیخ ابن عربی

نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کو میں استثناء کی ضرورت نہیں بلکہ یہ اپنے عموم پر بحالہا باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے اس پر نقض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں رویت کے قائل ہیں۔ اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سمٰوات و عرش مکان آخرت ہیں۔ وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہونچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل[1] رویت پیدا ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السّلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہ وہاں کھانے پینے اور بول و براز[2] سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہاں کی یہ خاصیت نہ ہوں۔ اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو۔ یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اسے کبھی موت نہ آئے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔ ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید۔ گر مُرغ کباب است کہ با بال و پر آید

دنیا و آخرت میں فرق

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ یکساں خاصیت نہیں۔ بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت ہے بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی ہوتی ہیں بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہتا ہے۔ اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خاص دنیا کے مکانات

---

[1] برداشت۔ [2] پائخانہ پیشاب

میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کیا وجہ ہے اس تحقیق سے سب معادیات سہل ہو جاویں گی۔ اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشا بجز قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں اور قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے۔

چنانچہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جملہ اہلسنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں۔ تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جاویگا جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا۔ جنت و دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔ اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا ہے اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا۔ وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا۔ اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کا پتہ چلتا۔ بس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح زمان آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے۔ گو دیکھنے والا ابھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔ پس قاعدہ مذکورہ منتقض[1] نہیں ہوا۔ جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔ اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام گو قوئ بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں۔

(تحصیل المرام صہ ۵)

---

[1] ٹوٹنا۔

۷۳) درود پڑھکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان سمجھنا غلط ہے

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور والا کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپئے ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں۔ تو اس نوکر کو مقبول بنانے کو اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو۔ رسول کے لئے رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہدیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جاوے گا کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے پر آپ پر رحمت ہوگی یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں! اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود، لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ کبھی مقبول اور کبھی مردود ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ معلوم ہو کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرورت رحمت بھیجتے ہی ہیں ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ اسی لئے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔

درود کا فائدہ

بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا ہے ہی۔ ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لئے نیز ہمارے اعمال ظاہر ہیں کہ

مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے۔ پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا۔ مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں۔ تب ہی رحمت ہوتی ہے اگر ہم آفتاب کے سامنے ہوگئے تو آفتاب نے ہم کو منور کردیا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں۔ پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا۔ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی تو آپ ہر حال میں ماجور تو ہوگئے۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں (ذکر الرسول ص ۳)

۷۴۔ مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے

اس وقت عام طور پر مسجد کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مجالس اسلامیہ کو آرائش وزیبائش سے بالکل تھیٹر بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

اے حضرات غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلے میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لئے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیئے بس ایک سچے مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے ؎۔

دل فریباں نباتی ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ حسن خدا داد آمد

یہود اپنی زینتیں دکھلائیں۔ نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں۔ ہنود اپنی زینتیں دکھائیں

اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا۔ تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو ماند کر دے گا۔ ارے صاحب! خدا نے وہ حُسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔ اے حسین! خدا نے تجھے وہ حُسن دیا ہے کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب ماہتاب شرماتے ہیں۔ ارے تو! پوڈر ملکے کاہے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے۔ تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حسن تیرے اصلی حُسن کو پوشیدہ کئے دیتا ہے۔ متنبی کہتا ہے ؎۔

حسن الحضارۃ مجلوب بتطریۃ — وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

یعنی شہر کی عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حُسن خداداد ہے واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہر کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ارے صاحب! مجلس اسلامی کے لئے یہ حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ٹھہرایا۔ اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کرسکے جتنا کہ دلی کا دربار، اور سلاطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیٹر۔ تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں ذلیل ہوئے۔

مجلس اسلامی کی شان

ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہوجاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے یہ کسی ناچ رنگ یا تھیٹر یا سرکس کا اسٹیج نہیں ہے۔ باہر سے مجلس بالکل سادہ ہو۔ اس کے بعد اندر پہنچیں تو صحابہ رضؓ کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے۔ لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادا سے رو سار کا سا تکبر نمایاں ہو۔ اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زیب زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ہے ورنہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا۔ اور اب . . . . . کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے

ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوب صورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرات میں لقسم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان وشوکت سے اس کی لیپ پوت کریں گے مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ۔ اسلام کی طرح مجالس اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہیئے۔

غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار اور رمود و اظہار کے لئے ہوتا ہے اور اس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو سب کو جمع کر لو۔ تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح غرض کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے مذاق کی کیا ضرورت ہے اگر کوئی روپیہ تقسیم کر رہا . . . . تو سائل خود بخود جمع ہو جائیں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے جو سائل روپیہ لینے آئے گا اسے مٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے روپیہ جعلی ہے۔ اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سجع ملائے بک جائے گا ورنہ مقفیٰ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھئے۔ دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور وشور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا۔

اہل حق کا کلام

اہل حق کے کلام میں ابتدار تو بہت دھیمی ہوتی ہے۔ مگر انتہار میں روز اور قوت اور خاص اثر ہوتا ہے ابتدار ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گل بار ہوتا ہے۔ بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

اور ملمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لئے ابتدار میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں

اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک ستار اور ہارمونیم سے بھی مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگداز ہوتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس برخاست ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کا اثر پائدار ہوتا ہے۔ مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا یک چمکدار گلٹ کے چمچے اور زنگ آلود روپئے میں روپیہ کا رنگ اگر نہ بھی چھوڑا و وہ ت بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلٹ کے چمچہ پر اگر گلٹ بھی چڑھا رہے پھر بھی اسے وئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اتر جاوے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں۔ غرض روپئے کو سفیدی ور چمک کی حاجت نہیں اور وہ جو گلٹ کا چمچہ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ ور بظاہر روپئے سے بھی زیادہ چمکدار ہے . . . . . . اس کی سفیدی ور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد دو کوڑی کا بھی نہ ملے گا ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد۔
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد۔

جب یہ کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے آ کھڑا ہوگا اور گلٹ کا چمچہ منہ چھپاتا پھرے گا ؎

نہ باشد اہل باطن درپئے آرائش ظاہر۔
بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی۔ آپؐ میں لف اور ظاہری وجہ میں کوئی شان وشوکت نہ تھی۔ کیونکہ آپ سچے تھے باوجودیکہ آپ اعلیٰ جہ کے قادر اور انتہا درجہ کے متین تھے مگر ساتھ ہی اس کے نہایت بے تکلف تھے۔

(اصلاح الیتامیٰ ص۱۲)

۷۵۔ حضرات انبیاء علیہم السلام واولیائے کرام کی حیات برزخیہ کا اثبات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ

جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں۔ قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں۔ صحابہؓ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث بھی نص ہے۔ انّ نبی اللّٰہ حیٌّ فی قبرہ یرزق[1] کہ آپؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق پہونچتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیاتِ برزخیہ کہتے ہیں۔

حیات برزخیہ کے مراتب

باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے۔ پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ تو تمام مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے تعلیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی۔ دوسری حیات شہداء کی ہوگی تمام مومنین کی حیات برزخیہ سے اقویٰ ہوگی عام مومنین کی حیاتِ برزخیہ بہ نسبت شہداء کے کمزور ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مومنین کی حیاتِ برزخیہ اس حیاتِ دنیویہ سے کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقویٰ ہونے کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھا سکتی اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا۔

شہید کی حیات

پس شہید میں اس کا اثر ظاہر ہونا اور عام مومنین میں نہ ہونا یہ دلیل ہے شہید کے حیات کے اقویٰ ہونے کی بہ نسبت عام کی حیات کے بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں اکثری ہے۔ اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جائے گا باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ تو جواب تسلیمی ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف کیا ہے وہ شہید ہی تھا۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں کہ

[1] اللہ کے نبی اپنی قبر میں بلاشبہ زندہ ہیں رزق پاتے ہیں

معرکہ میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں۔ مثلاً نیت کا خالص لوجہ اللہ ہونا۔ جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور حیات اقویٰ درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہوگا ہو کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس جگہ کی مٹی تیز ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جاوے جیسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریت زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی بعینہ محفوظ رہے گی۔

انبیاءؑ کی حیات

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لئے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی حدیث میں ہے۔ حرّم اللّٰہ اجساد الانبیاء علی الارض[1]۔ اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور وہ حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں تقسیم نہیں ہوتی۔ نحن معاشر الانبیاء لانورث ما ترکنا صدقۃ انبیاء علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت نے اس کا کوئی خاص راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امر سے۔ اور گو ازواج نبی سے بعد وفات نبی کے نکاح حرام ہونا تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں منقول نہیں ہوا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء نے میراث پر قیاس کر کے اس

[1] انبیاء کے جسموں کو زمین پر اللہ نے حرام کر دیا ہے۔

حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عوام مومنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا بہر حال یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں۔

نبی کریم کی حیات

اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہو جاتا تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کس بادشاہ کے وقت میں) دو شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے آئے تھے مسجد نبوی ؐ کے پاس ایک مکان کرایہ پر لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے وہ کمبخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے۔ اور جس قدر سرنگ کھودتے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ جگہ برابر کر دیتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔

سلطان مدینہ کا خواب

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر حزن و غم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرما رہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے۔ جلد مجھے ان سے نجات دو۔ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی۔ خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا وزیر نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں۔ بادشاہ نے فوراً فوج کو ساتھ لے کر بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر کیا۔ اور بہت جلد مدینے پہونچ گیا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہونچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہو جاتی

تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینے پہونچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم کیا۔ اور خود دروازہ پر کھڑے ہو کر ہر شخص کا چہرہ خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینے کے سب مرد شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو حیرت سخت ہوئی۔ اور لوگوں سے کہا کیا سب لوگ باہر آ گئے۔ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ضرور کوئی اندر رہا ہے۔

سرنگ کھودنے والے پکڑے گئے

لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے انہی سے کام ہے چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں جو خواب میں دکھلائی گئی تھیں ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے۔ چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر نکالنے کے لئے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ خود بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہونچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کروادی اور زمین کو پانی کی تہہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا۔ تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برس بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے۔ محض وہم و شبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے۔

(الجبور ص۱۴)

(۷۶) علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں

تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا۔ جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوگی۔ شاید یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جُدا جُدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے مثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں "ڑ" کا ہونا اور ہائے مخفی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے۔ کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ "ثا" سے مرکب ہے وہاں "سین" یا "صاد" پڑھ دینے سے یا "حا" کی "ھا" پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جاویں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی اب صفات کی بابت میں لکھتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جسمیں "نون" کے خفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے اسی طرح رنگ سنگ اور جنگ ہیں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کرکے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی پنکھے کو باظہار نون پن کھا کہے یا رنگ کو رن گ کہتے تو آپ کہیں گے کہ اردو فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہوگیا لیکن اس کے کہنے سے یا آپ بندھ گئے اسطرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفا ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

تجوید سیکھنا فرض ہے

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے۔ اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آسکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے۔

اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہوجائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم اے قاری ہوجائیں ہم لوگ متاع دنیا کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں محض بہانے ہیں۔ (اسباب الفتنہ ص۲۶)

۷۷ - علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض

یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں، مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دیکر کیوں پکڑا۔ یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے۔ وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں۔ اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو۔ ہم کسی کا

بھی علاج نہیں کرتے۔ وہاں ایک حکیم کو ترجیح دیکر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا۔ جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔؟۔

ضروری سمجھنے کے بعد

لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں۔ جو ایک گہری بات ہے۔ وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر وتامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں۔ جان اور ایمان جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت وحفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کریں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور وتامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔ تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے ہیں تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس! آپ کو ایمان عزیز نہیں اسلئے صاف سب کو چھوڑ دیا میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلادوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کردوں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہوجانا چاہیئے نااتفاقی بُری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ یا اس

کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہوجاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نااتفاقی کا ہونا ثابت ہوگیا۔ اور نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے۔ اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور وغل مچادیں گے کہ یہ کون سا انصاف ہے؟ کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیئے تھا۔ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں جو باہم مخالفت ونااتفاقی ہے ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلے سے ثابت ہوگیا کہ نااتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نااتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو۔ اور جو نااتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہوجائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جاسکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے۔ اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔

علماء کی نااتفاقی

پس علماء کی باہم نااتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کرلو۔ غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ حق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنے کے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کرلیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی۔ کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہوجانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے تو جناب ایسا اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت وطعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو

مسلمانوں کو آج پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آرہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے ۔

اختلاف کی بنیادی وجہ

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی زر ہو۔ اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہیں مقرر کردیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے۔ کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے۔ کوئی فاتحہ پر، کوئی تیجے دسویں پر۔ ایک عالم صاحب سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں ما شاء اللہ کی شان ہے کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی خیال کے ہوں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں) تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و درود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ نہ دیا جائے ان سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ۔ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ مٹھائی کا دوہرا حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آکر فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک ہی کافی ہے۔ میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو ہی گا۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کرادو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قصہ ہے۔ یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون کا بہت زور ہوا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا فاتحہ دلانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہوگیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ

کہاں گئے اور وہ اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے۔ اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی۔ میں نے کہا چھوڑا۔ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ بس سمجھ لو جو کام حذف ہوگئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہوگئے۔

فاتحہ مروجہ کا نقصان

اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اسمیں سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپئے پیسے اور کپڑے میں بھی ہوسکتا ہے پھر کبھی اللہ کے نام کے روپئے پیسے اور کپڑے پر فاتحہ پڑھی کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا۔ سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا۔ کہنے لگے اجی بس سمجھ میں آگیا۔ تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں۔ اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کردی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں میں سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کردی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو بآسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے اگرچہ بحمد اللہ سنت و اطاعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلادیں گے۔

اختلاف محل شکایت نہیں

غرض میں کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ پہلے آپ حق متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون، اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہوجائیگی۔ جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں